



www.safareadab.com

WEB SPECIAL NOVEL

ذو الکفہ

نور بانو



ڈو، کفل



از قلم نور بانو

All Rights Reserved

Copyright: Noor Bano (Author)

Published by: Safar-e-Adab

Published On: safareadab.com

To get published with us, contact us via email or website:

safareadab.com

safareadab@gmail.com

khanumaira@safareadab.com

adab@safareadab.com



BEING THE STRING OF YOUR KITE

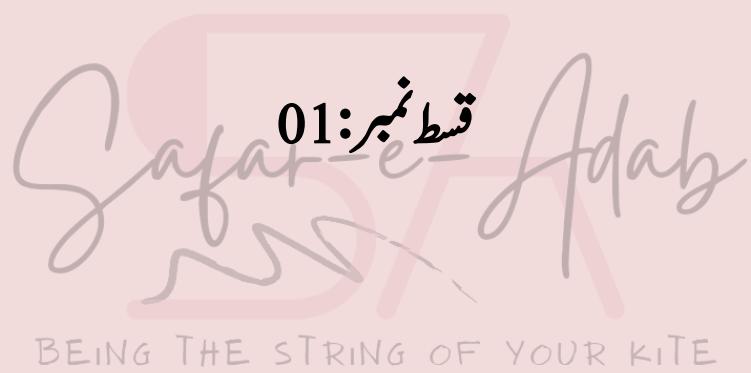
Note: We don't charge anything to publish online. If anyone charges any kind of fee in order to publish your write-ups in the name of Safar-e-Adab, please don't try to go ahead with them and immediately report them using the contact us button on our website. Thank you

ضروری بات

ڈوالکفل کے تمام جملہ حقوق لکھاری "نور بانو" کے نام محفوظ ہیں۔ کہانی کا کوئی بھی حصہ کسی بھی صورت میں کسی دوسرے پلیٹفارم یا سو شل میڈیا پر پوسٹ کرنے سے پہلے لکھاری کی اجازت درکار ہوگی۔ بغیر اجازت کہانی کا استعمال کرنے والوں پر سخت کارروائی کی جاسکتی ہے۔

اس کہانی اور اس میں موجود کردار مخصوص تصوراتی ہیں۔ کسی بھی حقیقی کہانی یا انسان سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کسی بھی طرح کی مشابہت کو اتفاق سمجھا جائے۔





16-December-2020

Saturday night

The Royal Oasis, Karachi.

دی رائکل اویس، کراچی کے پوش علاقے میں واقع ایک فائیو سٹار ہوٹل تھا۔ جہاں زیادہ تر الیٹ کلاس سے تعلق رکھنے والوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ بڑے بڑے پولیٹکل ایونٹس سے لیکر پاکستان کے نامور سلیبریٹیز کے اوپنیشنل ڈنز بھی وہاں منعقد کئے جاتے تھے۔

کراچی کے آسمان پر بکھرے بادل چاند کی روشنی میں خاموشی سے ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے اندر جھانک رہے تھے۔ کھڑکی کا پردہ ہلاکا سا ہٹا ہوا تھا۔ جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ایک لڑکی بستر کے کنارے پر بیٹھی اپنی ہائی ہیلز کے اسٹرپیں بند کرتی نظر آ رہی تھی۔ جبکہ داور علی باتحہ روپ میں ملبوس باتحہ روم سے تو یہ سے سر رگڑتا باہر آیا تھا۔

"تم اب تک یہی پر ہو؟"

داور نے بیزاری سے اُسے دیکھا۔ جو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنا میک اپ درست کر رہی تھی۔

"جس کام کے لئے آپ نے مجھے یہاں بلا�ا تھا۔ اس کام کے پیسے لگتے ہیں۔ اب اپنے پیسے لئے بغیر تو جانے سے رہی۔"

کندھے اچکا کر کہتے ہوئے۔ اس نے فوراً اپنے ہینڈ بیگ سے سیاہ بُرقع نکالا۔

اس نے ضبط سے تولیہ بستر پر اچھاتے ہوئے۔ جھک کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا والٹ اٹھایا اور چند ہزار کے نوٹ نکال کر اُس لڑکی کی جانب بڑھائے۔

جسے بلا توقف کے اس لڑکی نے لیکر اپنے ہینڈ بیگ کی اندرونی پاکٹ میں احتیاط سے رکھ لئے اور فوراً وہاں سے چلتی بنی۔

اب کمرے میں داور علی تہما موجود تھا۔ داور علی پاکستان کے معروف پولیٹیشن علی جبران کا ایک لوٹا بیٹا تھا۔ علی جبران اپنے بیٹے کو ایک بہترین پولیٹیشن کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔

مگر داور کے شوق کچھ الگ تھے۔ فلحال پولیٹکس میں اپنے ہاتھ گندے کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ اپنی جوانی پولیٹکس کے دلدل میں کود کر ضائع نہیں کر سکتا تھا۔

کھڑکی کا پردہ ایک جانب کو کھسکاتے ہوئے۔ داور نے سلگریٹ جلائی۔ نیچے پول ایریا میں چند ایک لوگ کھڑے تھے۔ البتہ گارڈن میں سنٹا تھا۔

داور کی سوچوں کا تسلسل ہوٹل روم کے دروازے پر پڑتی دستک سے ٹوٹا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑے۔ پیسے تو وہ اُسے دے چکا تھا۔ پھر کیا لینے واپس آئی تھی۔

اس نے جھنجھلا کر سگریٹ ایش ٹرے میں رگڑی اور کمرے کا دروازہ کھولا۔ مگر سامنے موجود شخص اس کی توقع کے بر عکس تھا۔ اس شخص نے سیاہ رنگ کی جیز پر سیاہ رنگ کا ہڈی پہن رکھا تھا۔ جس کی پشت پر سفید غزال کا پرنسٹ تھا۔ چہرہ ماسک کی آڑ میں چھپا رکھا تھا۔ کیونکہ ابھی حال ہی میں کرونا وائرس نے پورے ملک کو اپنے لپیٹے میں لے لیا تھا۔ گو کہ کرونا کی وبا ابھی پوری طرح سے ختم نہیں ہوئی تھی۔ مگر کاروباری مراسم ایک بار پھر زور و شور پر تھے۔ تھوڑی بہت احتیاط کے ساتھ لوگوں نے ایک بار پھر سے ایک دوسرے سے ملنا جੁنا شروع کر دیا تھا۔

ایک پل کے لئے اُسے سامنے دیکھ کر وہ ایک دم ٹھٹکا۔ وہ رات کے اس پھر اُس کی اچانک آمد کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اُس کے کندھے ڈھلکے۔ دروازے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے۔ داور نے راستہ چھوڑ دیا۔

بارہ گھنٹے بعد

دی رائل اویس کی پانچویں منزل پر واقع روم نمبر 502 میں مشہور پولیٹیشن علی جبران کے ایک لوٹے بیٹے داور علی کا قتل ہو چکا تھا۔ یہ نیوز پاکستان کے تمام چھوٹے بڑے نیوز چینز پر سنی خیز انداز میں سنائی جا رہی تھی۔ پورا سو شل میڈیا داور علی کے قتل سے گنگ رہ گیا تھا۔ ٹیوٹر پر داور علی مرڈر کیس کے ہیش ٹیکز ٹرینڈ ہو رہے تھے۔ ہوٹل کے باہر میڈیا کا ہجوم لگ چکا تھا۔

پولیس نے ہوٹل کی پانچویں منزل کو سیل کر دیا۔ فرازک ٹیم کمرے میں موجود قاتل اور مقتول کے سیمپلز کلیکٹ کر رہی تھی۔ جبکہ کرام سین کے تفتیش کار بھی وہاں موجود تھے۔

داور کی لاش بستر پر چت پڑی تھی۔ سفید باتھ روب اب پورا سرخ ہو چکا تھا۔ دل کے مقام پر آٹھ انچ کا چیرا تھا۔ ڈیڈ باؤڈی کو دیکھ کر انویسٹیگیشن آفیسر نے لمبے بھر کے لئے حیرت سے اپنی پیشانی کو چھووا کیونکہ اس کا دل اس کے سینے میں موجود نہیں تھا۔

"سر"

فرانزک ٹیم کے ایک بندے نے انویسٹیگیشن آفیسر کو حیرانگی سے پکارا۔ اس کی پکار میں کچھ ایسا تھا کہ سب نے بروقت اس کے اشارے کے تعاقب میں دیکھا۔ اور سب کے سب گنگ رہ گئے۔ داور علی کا دل تھوڑے فاصلے پر زمین پر پڑا تھا۔ وہاں موجود جتنے بھی لوگ تھے۔ سب نے خوف سے چھر چھری لی تھی۔ فرانزک ٹیم نے اس دل کو اٹھا کر احتیاط سے پلاسٹک بیگ میں ڈال دیا۔

ٹیبل پر ایک خالی گلاس رکھا تھا۔ جس کے نیچے ایک چٹ رکھی تھی۔ جس پر سیاہ قلم سے اردو میں کچھ لکھا تھا۔ پولیس آفیسر نے آنکھیں سکوڑ کر گلاس پرے کیا۔ اور چٹ اٹھا کر زیر لب وہ الفاظ پڑھے۔

"سفید غزال جسے زہر لیے سبب پسند ہیں"

سولہ گھنٹے پہلے یہاں آنے والا شخص کون تھا۔ جس نے داور علی کو اتنی بے رحمی سے قتل کیا تھا۔ داور اور اس نامعلوم شخص کے درمیان کیا رشتہ تھا؟ اور ایسا کیا ہوا تھا اس کمرے میں، جس کا نتیجہ داور علی کی موت کی صورت نکلا تھا۔

ان سب سوالوں کے جوابات کی تلاش میں نکلتے ہوئے۔ اس کیس سے جڑے لوگوں نے یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ داور علی قتل کیس پاکستان کی تاریخ کا سب سے پچیدہ کیس ثابت ہونے والا تھا۔

☆...☆...☆

سات ماہ بعد

آج سورج شاہراہِ دل تھانے پر ٹوٹ کر برس رہا تھا۔ میئی کی چلچلاتی دھوپ نے کراچی والوں کے چودہ طبق روشن کر رکھے تھے۔ جبکہ ڈی آئی جی سرمت لوہے والا صاحب اپنے ایئر کنڈیشنڈ روم میں آرام دہ کر سی پر براجمان تھے۔ سامنے ٹیبل پر دو چھوٹے رینک کے پولیس آفیسرز بھی بیٹھے تھے۔ ٹیبل پر داور علی قتل کیس کی فائل پڑی ان سب کی قابلیت پر منہ چڑا رہی تھی۔

پچھلے سات مہینوں میں انہیں کوئی ایک دن بھی ایسا میسر نہیں ہوا تھا کہ وہ لوگ سکون کا سانس لے پاتے۔ میڈیا والے آئے روز اس کیس پر چرچہ کرتے نظر آرہے تھے۔ سو شل میڈیا پر نکے پولیس آفیسرز کے بیش ٹیگز ٹرینڈ ہورہے تھے۔ یہ کیس میڈیا اور پولیٹیکل پریشر کی وجہ سے پاکستان کا ہائی پروفائل کیس بن گیا تھا۔ اور اس کیس کی جھاڑ چکنے کے بعد بھی کوئی ایک بھی کام کی لید ہاتھ نہیں لگی تھی۔ جو اس پزل کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہو پاتی۔

دن بدن یہ کیس الجھتا ہی جا رہا تھا۔ نیوز چینلز اور سو شل میڈیا پر پولیس کی گھٹیا کار کردگی کو تمغا ذلت سے نوازا جا رہا تھا۔

ڈی آئی جی سرمت نے مایوسی سے سامنے بیٹھے اپنے دو ہونہار آفیسرز کو دیکھا۔ جن کی ذہانت بھی اس کیس کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکی تھی۔

"حیرت کی بات ہے۔ 9:13 منٹ پر داور علی ہوٹل روم میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد 9:35 پر ایک برقع پوش لڑکی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ اور 11:02 منٹ پر چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد ناکوئی کمرے میں آیا اور ناکوئی باہر گیا پھر داور علی کا قتل کس نے کیا؟"

انہوں نے حیرت و پریشانی سے وہ سارے واقعات منه زبانی دھرا دیئے۔ جو انہوں نے ہوٹل کی سی-سی-ٹی-وی فوٹج میں دیکھے تھے۔ اس کیس سے متعلق ہر انفارمیشن انہیں ازبر تھی۔

"سر کیا پتا اُس برقع پوش لڑکی کا ہی ہاتھ ہو اس قتل کے پچھے۔"

سامنے بیٹھے آفیسر شخ نے کہا۔

"انہیں سر یہ ممکن نہیں وہ لڑکی ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اور یہ کام وہ اپنا اور اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو پالنے کے لئے کرتی ہے۔ اور تو اور اس کا کرمنل ریکارڈ بھی بلکل کلین ہے۔ میں نے اس کا بیگ گراونڈ پوری طرح سے کھنگلا ہے۔ کوئی بھی ثبوت اس لڑکی کے خلاف نہیں جاتا ہے۔"

برابر میں بیٹھے دوسرے آفیسر نے فوراً جواب میں کہا۔ ڈی آئی جی صاحب نے ٹینشن سے سر پکڑ لیا۔

"ہاں شخ، آفیسر عامر بلکل ٹھیک بول رہا ہے۔ کاریڈور کی فوٹج میں صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ روم سے نکلنے والی آخری شخص وہ برقع پوش لڑکی تھی۔ 11:02 کے بعد یہ دروازہ اگلی صبح 10:00 بجے ہوٹل کے عملے نے کھولا تھا۔"

ڈی آئی جی سرمت صاحب کے چہرے کے نقوش مزید تن گئے تھے۔ دونوں آفیسرز نے خاموش نظروں کا تبادلہ کیا۔

فوٹج بکل کلین تھی۔ مگر مرڈر تو ہوا تھا۔ رات 11:02 سے صبح 10:00 بجے کے درمیان کیا ہوا تھا۔ پولیس بھی یہ کھو جنے میں ناکام ہو گئی تھی۔

"سر یہ کیس تو بکل ہی کلیو لیس نظر آ رہا ہے۔ ہفتے اور اتوار دونوں دن کی فوٹج کو دس، دس بار دیکھا مگر کچھ بھی کام کا ہاتھ نہیں آیا۔ مجھے اس کیس میں کچھ بھی حل ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔"

آفیسر کی بات پر ڈی آئی جی سرمت نے دونوں کو باری باری پر سوق نگاہوں سے دیکھا۔ وہ دونوں ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔

کوئی دوسرا کیس ہوتا تو اب تک یہ فائل بند ہو چکی ہوتی مگر اس کیس کا تعلق علی جبران جیسے مکار اور گھٹیا پولیٹیشن سے تھا۔ اس کیس پر پریشر ڈالنے کی ایک وجہ علی جبران کی گندی پولیٹیکس بھی تھی۔ کیونکہ جب تک یہ کیس چرچے میں رہتا۔ تب تک علی جبران کی جھوٹی میں سمپاٹھی ووٹ گرتے رہتے اور اس کی پارٹی ایک کے بعد سیٹ نکالنے میں کامیاب ہوتی رہتی۔

"داور کے قاتل کو پکڑنا ہے تو ہمیں کوئی ایسا آفیسر چاہئے جو بہت ہی قابل اور چالاک ہو" ڈی آئی جی صاحب اپنی ہی بات پر ٹھکلے یکدم ان کے چہرے پر مسرت بخش مسکان نے احاطہ کیا تھا۔ جیسے ان کے ذہن میں کسی کی صورت اُبھری ہو۔

"یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا شیخ"

ڈی آئی جی صاحب کافی دنوں بعد اس طرح سے مسکراتے تھے۔ جواباً دونوں آفیسرز کی آنکھوں میں استفسار چمکا۔

"شاید اس کیس کو صحیح ہاتھوں میں پہچانے کا وقت آگیا ہے آفیسرز"

اُن کے لجھ میں جیت کا وزن تھا۔

"آپ کے ذہن میں کس کا نام ہے سر؟"

آفیسر عامر نے کچھ سوچتے ہوئے استفسار کیا۔ اُسے اپنا پولیس کریئر شروع ہوتے ہی ختم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ کیونکہ داور علی قتل کیس ایک ہائی پروفائل کیس تھا۔ اور اس کیس کو کامیابی سے حل کرنے کا مطلب تھا کہ کامیابی کی اونچائیوں کو چھونا۔ آفیسر شیخ کے ماتھے پر پہلی بار شکنوں کا گہرا جال ابھرا تھا۔ بہت مشکل سے یہ کیس اس کے ہاتھ لگا تھا۔ اب اگر یہ کیس کسی دوسرے پولیس آفیسر کے حوالے کر دیا جاتا تو آفیسر شیخ اسلام کا سلیبریٹی آفیسر بننے کا خواب، خواب ہی رہ جاتا۔

"سر؟"

خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو مقابل بیٹھے آفیسر ز نے بروقت ڈی آئی جی صاحب کو مخاطب کیا۔ اُنہوں نے چونک کر سامنے دیکھا پھر شاشگی سے مسکرانے۔

"ڈی ایس پی ذوالکفل سکندر خان"

BEING THE STRING OF YOUR KITE
نام سنتے ہی دونوں آفیسرز کا چہرہ اُتر گیا تھا۔ وہ اس نام کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ اگر ڈی آئی جی صاحب اس نام کی جگہ کوئی بھی دوسرا نام لے لیتے تو شاید وہ زور دے کر اُن سے ایک آخری موقع کی درخواست کرتے مگر اب ایسا کرنا بیو قوئی تھا۔ ذوالکفل سکندر پولیس ڈپارٹمنٹ کا وہ نام تھا۔ جس کے سامنے خود ڈی آئی جی سرمت صاحب بھی مختار رہتے تھے۔

"ذوالکفل سکندر خان کی ریکارڈ فائل میرے آفس میں بھیجو جلدی"

انظر کام پر حکم دینے کے اگلے پانچ منٹ بعد ذوالکفل سکندر کی فائل ان کی میز پر حاضر ہو گئی تھی۔ فائل پر سیاہ قلم سے ذوالکفل سکندر خان لکھا تھا۔ نام پر انگلی پھیرتے ہی ڈی آئی جی

صاحب کی آنکھوں میں تشكیر ابھرا جو سامنے بیٹھے آفیسرز سے ڈھکانہ رہ سکا۔ سرمت صاحب کے تاثرات دیکھ کر انہیں اپنے پولیس آفیسر ہونے پر شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔

☆...☆...☆

ڈپٹی سپرینٹنڈنٹ آف پولیس، ذوالکفل سکندر خان پاکستانی پولیس سروس کا فخر اور بچ نمبر چھبیس کا واحد ٹاپر تھا۔ جس نے نو سال کی سروس میں تین سو سے زیادہ کیسز سولف کئے تھے۔ چار پروموشنز، تیرہ ٹرانسفرز اور لاہور میں چھ ٹارگٹ کلرز کا انکاؤنٹر کرنے کے بعد دو ماہ کے لئے سسیئنڈ بھی ہو چکا تھا۔

اس کے بچ میں ایک سو بیس پولیس آفیسر تھے۔ اگر نا بھی ہوتے تب بھی وہ اُن ایک سو بیس آفیسرز کے برابر تھا۔ اُس کے کام کرنے کا ایک مخصوص طریقہ تھا۔

جس کیس کو آڑے ہاتھوں لیتا پھر سولف کر کے ہی دم لیتا۔ ڈیپارٹمنٹ میں وہ واحد نڈر آفیسر تھا۔ جو اپنے سینئرز کے فیصلوں کو ڈنکے کی چوٹ پر مسترد کر دیا کرتا تھا۔ اسلام آباد میں وومن ٹریننگ کیس میں ذوالکفل کی کارکردگی اور اُس کے بے باک و نڈر انداز کو دیکھتے ہوئے۔ مرحوم ڈی آئی جی آف اسلام آباد نے ایک نامور نیوز چینل کے ٹاکشو میں اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"جس زمین پر ذوالکفل جیسا آفیسر موجود ہو۔ وہ زمین کبھی بخبر نہیں ہو سکتی۔"

اس اسٹینٹ کی حقیقت کا اندازہ اس کے پولیس ریکارڈ کو دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ اس ٹاکشو کے ان ایئر ہونے کے بعد ذوالکفل کے دشمنوں میں چند ناموں کا مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ بہت سے نیوز چینلز نے اُسے انٹرویو کے لئے اپنے شو میں مدعو بھی کیا تھا۔ لیکن اس کی زندگی کا مقصد ٹو وی پر بیٹھ کر موٹیویشنل لیکچرز دینا نہیں تھا۔ اس کا مقصد پاک سر زمین کی

نایا کی کو مجرموں کے خون سے غسل دینا تھا۔ عام لوگ اس سے جتنی محبت کرتے تھے۔ مافیا اور کرامہ کی دنیا میں اس سے نفرت کرنے والوں کی بھی کمی نہیں رہی تھی۔ ڈی آئی جی صاحب نے ذوالکفل کی فائل بند کی تو آنکھوں میں چاند سی چمک اور چہرے پر تشکر بھری مسکراہٹ تھی۔ جیسے انہوں نے ذوالکفل کا ریکارڈ نہیں صدام حسین کی تاریخ پڑھ لی ہو۔

ایس اچھ اور شیخ اسلم کو اپنے بدن پر گوز بکمپس محسوس ہوئے تھے۔ جبکہ عامر کو اپنے سینے میں تفاخر محسوس ہوا۔ پولیس ڈپارٹمنٹ میں ایسے بھی پولیس آفیسرز موجود تھے۔ حیرت کی بات تھی۔

"اس وقت ڈی ایس پی صاحب کدھر ہیں؟"

عامر کو اچانک ہی ذوالکفل سکندر میں دلچسپی ہونے لگی تھی۔ ہوتی بھی کیوں نہیں، سروس کے ان تین سالوں میں اس کا سامنا بھی تک رشوت خور اور ہڈحرام پولیس آفیسرز سے ہی ہوا تھا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

"لاہور"

ڈی آئی جی صاحب نے عامر کی غیر معمولی دلچسپی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

☆...☆...☆

رات کے دونج رہے تھے۔ آسمان پر سیاہ گھنگور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ لاہور پر بادل جم کر بر س رہے تھے۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں سڑک بمشکل دکھائی دے رہی تھی۔ ایسے میں ایک سفید آٹھو دھیمی رفتار میں دھنڈ اور بارش کی بوندوں کو چیرتی شہر کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک خوش شکل نوجوان بر اجمان تھا۔

سیاہ چمکدار آنکھوں پر نظر کے چشمے ٹکار کھے تھے۔ جبکہ برابر والی سیٹ پر آدمی عمر کا آدمی بیٹھا تھا۔ جو غالباً اس نوجوان شخص کا باپ تھا۔

پچھلی نشست پر ادھیر عمر خاتون اور ایک جوان دوشیزہ بھی موجود تھی۔ بظاہر یہ لوگ مذل کلاس طبقے سے تعلق رکھنے والی چھوٹی سی فیملی کا تاثر دے رہے تھے۔ جو شاید کسی شادی سے واپس گھر کو لوٹ رہے تھے۔

اچانک ٹائر پھٹنے کی زور دار آواز ویران ہائی وے پر گونجی اور گاڑی گیلی سڑک پر پھسلتی ہوئی تھوڑے فاصلے پر جھٹکے سے جا کر بند ہو گئی۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے نوجوان فوراً گاڑی سے اترے، اسٹریٹ لائمس کی مدھم سی روشنی میں انہوں نے دیکھا کہ گاڑی کے اگلے اور پچھلے دونوں ٹائر پھٹ چکے ہیں۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے نوجوان نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ سڑک کے دونوں جانب اندھیرے میں ڈوبا ہرا سبزہ تھا۔ جہاں دور تک انسانوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اس نے غور سے سڑک کی جانب دیکھا۔ وہاں کچھ چمک رہا تھا۔ بارش بھی اب ہلکی ہو چکی تھی۔ ذرا غور کرنے پر اس نے دیکھا کہ وہاں زمین پر بہت ساری کیلیں پڑی تھیں۔ جیسے کسی نے جان بوجھ کر اُن کی گاڑی کے ٹائر کو نقصان پہنچانے کے لئے وہاں پھینکی تھیں۔

وہ جیسے ہی سیدھا ہوا۔ اُسے اپنی پشت پر کسی غیر مانوس شخص کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ سینکڑز کے ہزاروں حصے میں پورا معاملہ سمجھ گیا تھا۔ وہ چار لوگ تھے اور جلیے سے افغانی لگتے تھے۔ ایک شخص نے اس کی کنٹی پر بندوق ٹکار کھی تھی۔ جبکہ دو لوگ گاڑی میں بیٹھیں خواتین سے مال بٹور رہے تھے۔ ادھیر عمر شخص کی قمر پر بھی بندوق کی نال لگکی تھی۔

"تم لوگوں کے پاس جو بھی سامان موجود ہے خاموشی سے ہمیں دے دو"

اُس کے ساتھ کھڑے شخص نے بلند آواز میں کہا۔ وہ یقیناً اُن تینوں کا سراغنہ تھا۔ رات کے اس پہر اس سنسان ہائی وے پر ان کی مدد کو کون آنے والا تھا۔ لہذا گاڑی میں بیٹھی دونوں خواتین نے خاموشی سے ہاتھ اور کانوں میں پہنے زیور اُتار کر اُن کے حوالے کر دیئے۔ وہ لوگ کافی عرصے سے ہائی وے پر ڈکیتی کی وارداتیں سر انجام دے رہے تھے۔

گاڑی میں بیٹھی خواتین سے زیور اور موبائل لینے کے بعد انہوں نے ادھیر عمر شخص کی تلاشی لی۔ اُن کے پاس سے ایک ستا سا موبائل اور تھوڑا بہت کیش برآمد ہوا۔ اب اُس نوجوان شخص کی باری تھی۔ گروہ کا سراغنہ اس کی تلاشی لینے لگا۔ باقی تینوں جلدی جلدی لوٹا ہوا سامان ٹھکانے لگانے میں مصروف تھے۔ کوٹ کی پاکٹ سے موبائل نکالنے کے بعد جیسے ہی اس نے کوٹ کی اندروںی پاکٹ میں ہاتھ ڈالا۔ سراغنے کے چہرے کے نقش تن گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ حرکت میں آتا۔ اُس ہٹنے کٹنے نوجوان کے ہاتھ پھرتی سے چلنے لگے۔ گھٹنے سے سراغنے کے پیٹ پر دار کرتے ہوئے۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی کو مخصوص انداز میں اس طرح مردوڑا کہ اس کے ہاتھ سے بندوق ڈھیلی ہو کر زمین پر گر گئی۔ اس افتد پر وہ لوگ ہکا بکا ہو گئے۔ یہ مزاحمت ان لٹیروں کے لئے غیر متوقع تھی۔ ادھیر عمر آدمی نے موقع دیکھ کر اپنی پنڈلیوں میں موجود گن نکال کر دو فائر کئے اور اُن کا ایک ساتھی موقع پر زخمی ہو گیا۔

گاڑی میں موجود دونوں خواتین بھی حرکت میں آچکی تھیں۔ اُن کا دھیان خود پر ناپاکر دونوں جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر آئیں۔ دروازہ زور سے اُن کے دوسرے ساتھی سے ٹکرایا۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا، اس سے پہلے کے وہ سنجلتا نوجوان لڑکی نے اس پر فائر برسا دیئے۔ یہ دیکھ کر ان کا ایک آدمی اپنی جان بچا کر بھاگنے لگا۔

جس پر ادھیر عمر خاتون اور دو شیزہ نے موقع پر فائر مار کر اُسے زخمی کر دیا تھا۔ ایک لمحے میں پورا منظر بدل گیا تھا۔ آٹلو میں موجود وہ چار لوگ کوئی ڈل کلاس فیملی نہیں بلکہ پولیس آفیسرز تھے۔ جو ان سفاک ڈاکوؤں کے گروہ کو پکڑنے کی نیت سے بھیس بدل کر یہاں آئے تھے۔

کیونکہ پچھلے کئی مہینوں سے لاہور ہائی وے پر ہونے والی ڈکیتی کی وارداتوں نے لوگوں کے دلوں میں خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا۔ یہ لوگ بڑی چالاکی سے رات میں گزرنے والی گاڑیوں کو روکتے اور ان کا سارا قیمتی ساز و سامان لوٹ لیتے اور جو بھی مزاحمت کرتا۔ یہ لوگ بے رحمی سے انہیں جان سے مار دیتے۔

بہت سے لوگوں نے ان حادثوں کی شکایتیں بھی درج کیں، مگر کوئی قانونی کارروائی نہیں کی گئی۔ کیونکہ ان ڈاکوؤں کی کمائی کا آدھا حصہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے کرپٹ آفیسرز کی جیبوں کو گرم کرنے میں صرف کیا جاتا تھا۔ جس وجہ سے یہ لوگ بے خوف، دندناتے ہوئے۔ لوٹ مار کرتے تھے۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE
اگلے دس منٹ بعد کا منظر کچھ یوں تھا کہ چاروں ڈاکو بدحواس سے زخمی حالت میں پڑے تھے۔

پولیس کی دو موبائلز اور ایک ایمبولینس بھی وہاں پہنچ چکی تھیں۔ زخمی ڈکیتیوں کو ایمبولینس میں ڈالا جا رہا تھا۔ جبکہ ان کا سراغنہ اب بھی اس نوجوان پولیس آفیسر کو نفرت سے دیکھتے ہوئے مغلظات بک رہا تھا۔

"تجھے معلوم نہیں ہے کہ تو نے کس پر ہاتھ ڈالا ہے۔ بس ایک بار مجھے جیل سے چھوٹنے دے۔ تیرا تو میں وہ حشر کروں گا کہ بندوق پکڑنا بھی بھول جائے گا۔"

سرغندہ غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔

پولیس آفیسر نے پلٹ کر اس شخص کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ جو قد میں اس کے گھٹنے جتنا بھی نہیں تھا۔ اس کے ہونٹوں پر جنبش سی ہوئی تھی۔ مگر عین اُسی وقت موڈن کی "الله اکبر" کی صدائوں نے الفاظوں کو اس کے ہونٹوں کی جنبش میں قید کر دیا۔ رات کی سیاہی نے دم توڑا آسمان پر دھیرے صح کی ہلکی نیلی روشنی پھیل رہی تھی۔ خالی آسمان پر چرند پرند اڑان بھرتے دکھائی دینے لگے۔

ذوالکفل کی سرد خاموشی نے ماحول میں پُر اسراریت سی پھونک دی تھی۔ اطراف میں موجود پولیس کا نسٹیبلز سانس تھامے، موڈب اور چوکس سے کھڑے تھے۔ وہ سب جانتے تھے۔ ذوالکفل سکندر خان کا غصہ بہت خراب تھا۔ اور اس کے ہاتھوں کی مار اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ اُس کی نظروں کے سرد پن نے اُس سر پھرے سرغندے کو ایک سانیے کے لئے خاموش کر دیا تھا۔ موڈن خاموش ہوا تو فضا میں سکوت چھا گئی۔ ذوالکفل آہستگی سے دونوں کے درمیان موجود فاصلے کو عبور کرتا۔ اُس کے سامنے آکر رُکا۔ اس کی شخصیت کے رعب کو محسوس کرتے ہوئے۔ وہ شخص غیر دانستہ طور پر ہلاکا سا پیچپے ہوا تھا۔

"شکر کر اُس ذات کا جس کی وجہ سے تو یہاں زندہ کھڑا ہے۔ ورنہ خدا کی قسم فجر کی نماز کے ساتھ تیرا جنازہ بھی پڑھ دیتا۔"

آذان کے وقٹے نے اس کے اندر کے اشتعال کو کچھ ٹھنڈا کر دیا تھا۔ ورنہ دوسری صورت کافی واضح تھی۔

اُس کی شخصیت میں ایک غیر معمولی سادبده تھا۔ جس نے مقابل کو خود بخود ٹھنڈا کر دیا تھا۔ وہ شخص جھاگ کی طرح ہلاکا ہو گیا۔ اور بنا کسی مزاحمت کے چپ چاپ پولیس وین میں جا کر بیٹھ گیا۔

"سر ڈی آئی جی کراچی نے آپ کو یاد کیا ہے۔"

پولیس موبائل میں بیٹھتے ہی پچھے بیٹھے پولیس کانسٹبل نے اُسے آگاہ کیا۔ اس نے ایک نظر بیک مرر میں کانسٹبل کو دیکھا۔

"چلو دیر آئے پر درست آئے"

ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے وہ معنی خیزی سے مسکرا یا۔

☆...☆...☆

آج کی محفل پیش فاسنڈر زفاؤنڈیشن کی جانب سے خاص طور پر جاناں سبز واری کے لئے منعقد کی گئی تھی۔ پیچ لگڑری کے گارڈن کو سفید قمقوں سے سجا دیا گیا تھا۔ گارڈن کے ایک حصے میں دو لمبی قطاروں میں مستطیل میزیں لگی تھیں۔

ان میں سے ایک میز کے گرد موجود چار کرسیوں میں سے ایک پر زرینہ سبز واری اور دوسری پہ سارہ بیگ بر اجمان تھیں۔ دوسرے حصے میں پولیس کے لوگ موجود تھے۔ اسٹچ کے سامنے کرسیوں کی دو قطاریں تھیں۔ جہاں اردو ادب سے وابستہ ایک خاص طبقہ بیٹھا ہوا تھا۔ گلابی اور سفید پھولوں سے مزین اسٹچ پر جاناں سبز واری پیلے رنگ کی کرتی پچامے میں ملبوس میچنگ ڈوپٹہ گلے میں ڈالے پر اعتماد سی بیٹھی جرنلسٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ سفید چمکدار چہرے پر اس کی آنکھیں آسمان پہ پھیلے اندھیرے جتنی تاریک تھیں۔ کمر تک آتے سیاہ بالوں میں سنہرے رنگ کی اسٹریکنگ کروائی

ہوئی تھی۔ وہ ہر سوال پر پہلے میکانگی انداز میں خوبصورتی سے تراشی ہوئیں بھنویں اُچکاتی پھر سرخ متورم ہونٹوں پر زنبش پیدا ہوتی۔

پیش فائنسڈر رز فاؤنڈیشن کا مقصد پاکستان کے نئے ابھرتے لکھاریوں کے جذبے کو فروغ دینا اور ان کے ہنر کی حمایت کرنا تھا۔ ہر سال ملک بھر سے نئے لکھاری ان کے بیسٹ ناول آف دا ایئر کے مقابلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ جس رائٹر کی کہانی ججز کو پسند آتی۔ اس کہانی کو کو پیشن شن فائنسڈر رز نہ صرف کتابی صورت میں پبلش کرتے بلکہ بڑے پیمانے پر فروغ بھی دیتے۔

آج کی شب جاناں سبزاداری کے لئے بہت اہم شب تھی۔ کیونکہ آج اس کی پہلا ناول کتابی صورت میں اُن کے پلیٹ فارم کے توسط سے لانچ ہو رہی تھا۔ وہ اس تقریب کی مہمان خصوصی تھی۔

"مس جاناں آپ صرف کرامم تھرلر کیوں لکھتی ہیں؟"

جرنلسٹ نے انٹرویو سیشن کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیونکہ مجھے کرداروں کو مارنا پسند ہے۔"

وہ پُر اعتمادی سے بولی۔

"آپ نے اب تک تین ناولز لکھے ہیں۔ مگر ان میں سے کسی ایک کی بھی ہیپی اینڈنگ نہیں۔۔۔ ایسا کیوں؟"

گھری سانس حلق سے اُتارتے ہوئے اس نے سامنے دیکھا۔

"مجھے ہیپی اینڈنگ پسند نہیں، ہیپی اینڈنگ کافی بورنگ ہوتی ہیں۔ آئی جسٹ لو ٹریجڈیز۔۔۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔ جب دو پیار کرنے والے بچھڑ جاتے ہیں۔"

اس کا جواب سن کر بہتوں کے چہروں پر حیرت کے تاثرات ابھرے تھے۔ کسی کی مسکراہٹ میں ستائش تھی تو کسی کی آنکھوں میں اختلاف تھا۔

"آپ کو نہیں لگتا کہ آج کل کی نوجوان نسل کا رجحان رومانٹک ناولز کی جانب زیادہ ہے تو کیا مستقبل میں ہمیں آپ کے قلم سے محبت پر بھی کچھ پڑھنے کو ملے گا؟"

"محبت؟"

اس کے چہرے پر یاسیت بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ دل پر بہت سی پُرانی یادوں نے ایک ساتھ دستک دی تھی۔

"محبت میرا جائز نہیں۔"

اس نے بے مقصد ہی چہرہ ہلاکا سا جھکا کر گھولتی لٹ کو آہستگی سے کان کے پیچھے اڑسا۔ سامنے لوگوں کا ایک ہجوم موجود تھا۔ فلیش لائٹس کی روشنی میں ان کی شکلیں بعض دفع ڈھنڈلی ہو جاتی تھیں۔

اُن چہروں میں ایک چہرہ اور تھا۔ جس کی آنکھیں جانان سبز واری کو دیکھ کر خیر ہوئی تھیں۔ اُس شخص کا دل جانان کو دیکھ کر کراکرم ایکسپریس کی اسپیڈ سے دھڑک رہا تھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے مس جانان کہ آپ یہ مقام کیوں ڈیزروو کرتی ہیں؟"

"یہ جگہ میں اس لئے ڈیزروو کرتی ہوں کیونکہ میں اپنے ساتھی رائٹرز سے حسد نہیں کرتی۔"

چجکھے اپنے سوا کسی اور کی کامیابی یا فلیئر سے فرق ہی نہیں پڑتا۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ کل کو اگر دس بہترین مصنفین کی فہرست لگی ہوگی تو میں اس فہرست میں صرف اپنا نام ڈھونڈوں گی نا کہ اپنے ساتھی رائٹرز کا۔ اور اگر میرا نام وہاں نہ ہوا

تو جاناں سبز واری اس امر کو یقینی بنائے گی کہ اس کا نام بیست رائٹرز کی فہرست میں سب سے اوپر لکھا ہو۔"

"آپ کی باتوں سے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ جاناں سبز واری ایک خود پرست انسان ہے؟"
وہ اس سوال پر ذرا سا مسکرانی۔

"اگر خود کو ولیو دینا خود پرستی ہے تو ہاں میں ایک خود پرست انسان ہوں۔ اور مجھے اس بات پر رتی بھر بھی شرمندگی نہیں۔"

My life is all about me, not about who is standing behind me."

اس نے کمیرے کی آنکھ میں آنکھ ڈالتے ہوئے۔ گردن کڑا کر یوں دیکھا جیسے وہ کمیرہ نہیں واقعی کوئی انسان ہو۔ زرمیں سبز واری اپنی بیٹی کو پر اعتمادی سے جوابات دیتا دیکھ کر تفاخر سے مسکرائیں۔ سارہ بیگ نے اپنی بہن کی آنکھوں میں تشکر و تفاخر کے ملے جلے تاثرات اُبھرتے دیکھے تھے۔ وہ بھی اپنی بھانجی کو دیکھ کر فخر سے مسکرانی تھیں۔

"مس جاناں ایک آخری سوال"

BEING THE STRING OF YOUR KITE

جاناں نے رُخ دوسرے جرنلسٹ کی جانب پھیرا۔

"آپ کی نظر میں بے وفائی کیا ہے؟"

سوال موضوع سے بلکل ہٹ کر تھا۔ اس نے ایک نظر کی نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ چہرے پر بیک وقت بہت سے تاثرات اُبھرے تھے۔ البتہ آنکھیں ہر احساس سے خالی تھیں۔

"بے وفائی پورے ہوش و حواس میں کیا جانے والا گناہ ہے۔ جس کی کوئی معافی نہیں ہاں البتہ اس گناہ کی ایک سزا ضرور ہے۔"

دانستہ طور پر جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے۔ وہ طنزیہ سی مسکراہٹ بہت معنی خیز اور گھری تھی۔

اور اسی کے ساتھ وہ اپنی کہانی کے ایک اور کردار کا انجام لکھ چکی تھی۔ سب نے اُسے ستائش نظروں سے دیکھا۔ بلاشبہ وہ ایک بہترین مصنفہ تھی۔ جس کے لفظوں میں تاثیر خدا نے بے حساب رکھی تھی۔

"سارہ، ریم تقریب میں کیوں نہیں آئی میں اُسے یاد کر رہی تھی اور عرفات بھی نظر نہیں آرہا ہے"

زرمینہ نے رُخ اپنی بہن کی جانب پھیرتے ہوئے استفسار کیا۔

"آج ریم کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لئے وہ آنہیں سکی، میں اُسے کہوں گی کہ تمہیں فون کر لے اور عرفات کو یہاں اپنے کچھ دوست مل گئے تھے۔ شاید اُنہی کے ساتھ ہو گا۔"

آنہوں نے پانی کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے کہا تو زرمینہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

سوالوں کا سلسلہ ختم ہوا تو جاناں استیح سے اُتر کر سیدھا ان کی میز کی جانب آگئی۔ وہ باری باری اپنی امی اور خالہ جان سے بغل گیر ہوئی۔ ایک طاریہ نگاہ اطراف میں بھی ڈالی تھی۔ اس کے چہرے پر قوس قزح کے رنگ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ شاذ و نادر ہی دل کھول کر مسکراتی تھی۔ زرمینہ نے آنکھوں آنکھوں میں اس کی نظر اتاری۔

"مجھے تم پر فخر ہے جاناں، ریم کی طرح تم نے بھی ہمارا نام روشن کر دیا"

سارہ بیگ نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ ریم کے ذکر پر ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے کا رنگ ماند پڑا۔ اس نے اپنے چہرے کی مسکراہٹ کو برقرار رکھتے ہوئے سر اثبات میں ہلا�ا۔

"یہ تمہارے لئے۔"

انہوں نے سلوور رنگ کے موتیوں والے لفج سے ایک بھاری سالفافہ نکال کر اس کی جانب پڑھایا تھا۔

"نہیں خالہ جان اس کی کوئی ضرورت نہیں" بے دلی سے مسکراتے ہوئے انکار کیا۔ ریم کے ذکر پر موڈ تو پہلے ہی بگڑ چکا تھا۔ "رکھ لو خالہ کی جان۔"

انہوں نے شفقت سے کہا۔ جاناں نے ایک نظر اٹھا کر ان کی تمکنت بھری نگاہوں میں دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پر نرم سی مسکراہٹ تھی۔ لبھے میں ڈھیر سارا پیار اور مان تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرائی اور لفافہ پکڑ لیا۔

پچھلے سال کی بات تھی جب ریم بیگ کو پیش فائنڈر ز فاؤنڈیشن، ہی کی جانب سے بیسٹ رائٹر آف دا ایئر کا اعزاز ملا تھا۔ اور اس کے ناول کو سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ناولز کی فہرست میں شامل کیا گیا تھا۔ تب اس کے دو ناولز ڈاگجوٹ میں پبلش ہو چکے تھے۔ مگر جاناں کو کارئین کی جانب سے وہ رسپانس نہیں ملا تھا۔ جس کی وہ توقع کر رہی تھی۔ خاندان میں ہر کوئی ریم بیگ کی کامیابیوں پر چرچہ کر رہا تھا۔ اور جاناں سبز واری جیسے پس منظر میں چلی گئی تھی۔ حالانکہ وہ کبھی بھی لوگوں کی ستائش کی طلب گار نہیں رہی تھی۔

مگر ریم جان بوجھ کر اُسے نیچا دکھانے کے لئے اس طرح کی گھٹیاں حرکتیں کرتی تھی۔ ناجانے کیوں مگر بچپن سے لیکر آج تک ریم بیگ نے اس کا ہر چیز میں مقابلہ کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ہر لحاظ سے ریم سے بہتر تھی۔ وہ ہمیشہ سب کی توجہ کا مرکز رہی تھی۔ خوبصورتی میں، پڑھائی میں وہ ریم سے دس قدم آگے تھی۔ اور اُسے اس بات سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ مگر ریم کو اس بات سے بہت فرق پڑتا تھا۔ شاید وہ اندر ہی اندر احساس کمتری کا شکار تھی۔

خود کو لوگوں کی نگاہوں میں اوپر رکھنے کے لئے وہ ہمیشہ جاناں کو نیچا دکھانے کی کوششیں کرتی تھی۔ لوگ یہ بات نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن جاناں جانتی تھی۔

جاناں نے بے دلی سے سر جھٹکا۔ آج اس کے لئے بہت بڑا دن تھا۔ وہ ریم کے بارے میں سوچ کر اپنا دل اداں نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆...☆...☆

جاناں سبز واری نے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں ٹاپ کیا تھا۔ یونیورسٹی کی جانب سے اُسے تین لاکھ روپے کی اسکالر شپ بھی حاصل ہوئی تھی۔ جس کی خوشی میں زریغہ سبز واری نے اپنے گھر میں دعوت رکھی تھی۔ اس دعوت میں سارہ بیگ بھی اپنے بیٹے عرفات بیگ اور بیٹی ریم بیگ کے ساتھ مدعو تھیں۔ اپنی بھانجی کی ہر کامیابی پر وہ اسی طرح سے بڑھ چڑھ کر شامل ہوتی تھیں۔ ان کے نزدیک ریم اور جاناں ایک جیسی تھیں۔ انہوں نے کبھی دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا تھا۔ اور یہی بات ریم کو ہمیشہ ہٹکتی تھی۔ وہ جہاں بھی جاتی تھی۔ سب کی توجہ سے مرکز بن جاتی تھی۔ پہلے سہیل عباس پھر سارہ بیگ۔۔۔ کبھی کبھی تو لگتا تھا۔ اس کے ماں باپ اس سے کم اور جاناں کو زیادہ چاہتے ہیں۔

جاناں کی گردن آج فخر سے تی ہوئی تھی۔ وہ خوشی سے لوگوں کے درمیان بیٹھی اپنی کامیابی کی مبارکباد وصول کر رہی تھی۔ اور ریم خاموشی سے صوفے کے کنارے سے ٹک کر ضبط سے تماشہ دیکھ رہی تھی۔

جاناں اس کے مقابل صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھی۔ گاہے بگاہے ایک نظر ریم پر بھی ڈال لیتی تھی۔ جس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ سانویں رنگت والے چہرے پر اُداسی واضح تھی۔ اتنا سکون اُسے ٹاپ کر کے نہیں ملا تھا۔ جتنا ریم کو کرب میں دیکھ کر مل رہا تھا۔

محنت تو ریم نے بھی بھرپور کی تھی۔ مگر وہ چاہے جتنی بھی محنت کر لیتی۔ بے شک ایڑی چوٹی کا زور لگا لیتی مگر جانان جتنے ہائی مارکس اسکور کرنا۔ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ کچھ لوگ کمر توڑ محنت کرنے کے بعد بھی ٹاپ نہیں کر پاتے۔ ان میں غیر معمولی صلاحیتیں نہیں ہوتیں۔ ان میں ٹاپرز جیسا چارم نہیں ہوتا۔ وہ جتنا بھی پڑھ لیں۔ ان کے گریڈز ایورج ہی رہتے ہیں۔ جس وجہ سے ان میں جو خداداد صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ وہ بھی بعض دفع پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔ ان کی زندگی لوگوں کی توجہ حاصل کرنے میں گزر جاتی ہے۔ اس دنیا میں لوگوں کی نظروں میں امتیازی حاصل کرنے کا ایک واحد نسخہ کامیابی ہے۔ کامیاب ہو جاؤں تو دنیا قدم چوئے گی ورنہ لوگ تمہیں اسی طرح نظر انداز کریں گے۔ جیسے اس وقت وہ لوگ ریم کو کر رہے تھے۔

وہ ڈرائیور میں اُداس سی ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ سب جانان سبز واری کے ارد گرد جمع تھے۔ سب اس کی تعریفیں کر رہے تھے۔ یکدم ریم کے موبائل پر نوٹیفیکیشن چمکی۔ جس نے اداسی سے ایک نظر موبائل پر ڈالی، ایک پل میں اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ "امی ما نکرو سافٹ نے میری آن لائن پیدا اسٹرنشپ ریکوئست قبول کر لی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ مجھے پچاس ہزار ڈالر مہینہ پے بھی کریں گے"

یہ خبر سنانے کی دیر تھی۔ جو بھیڑ جانان سبز واری کے ہنر کے قصیدے پڑھنے میں مگن تھی۔ ریم بیگ کے ارد گرد مدھو مکھی کی طرح بھینھنا نے لگی۔ واقعی کامیابی میں مقناطیسیت سی کشش ہوتی ہے۔ یہ ہر کسی کو اپنی جانب کھینچنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

"واہ ریم تمہاری تو بات ہی آگ ہے"

کسی نے تبصرہ کیا۔

"ہاں ہمارے خاندان میں آج تک کسی کو مائیکرو سافٹ سے پیدا نہ شپ نہیں ملی۔۔۔ تم تو ڈالرز میں کماو گی اب"

ریم بیگ مالی طور پر اتنی مضبوط تھی کہ اُس کے لئے پچاس ہزار ڈالر کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ سوتیلی ہی سہی مگر وہ شاہنواز بیگ کی بیٹی تھی۔ جو پیشے سے سیاستدان تھے اور سیاستدانوں کو پیسے اور بد دعاؤں کی کبھی کمی نہیں رہتی۔ وہ تو یہ سب اس لئے کرتی تھی۔ تاکہ وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن سکے اور اپنے اس مقصد میں وہ کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر جاناں سبز واری سے اس کی لائم لائٹ چڑالی تھی۔

جانان نے کینہ توز نگاہوں سے ریم کی جانب دیکھا۔ جو حقارت اور نفرت کچھ دیر پہلے ریم کی آنکھوں میں تھی۔ اب جاناں کی آنکھوں میں صاف نظر آرہی تھی۔ ایک بار پھر ریم بیگ نے بہت چالاکی سے جاناں سبز واری کی خوشیوں میں گرہن لگا دیا تھا۔ جاناں نے ایک نگاہ اٹھا کر زریمنہ کو دیکھا۔ جو سارہ بیگ کے بغل میں بیٹھی تھیں۔ وہ اپنی بیٹی کے ذہن میں چلتے خیالات سمجھ گئی تھیں۔ مگر وقت کی نزاکت نے انہیں خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"جان مہمانوں کے لئے چائے بنائے بیٹا"

انہوں نے ملتجیانہ نظروں سے اُسے چپ رہنے کا کہا۔ وہ بادل ناخواستہ صوفے سے اٹھ گئی۔ جاناں کچن میں مہمانوں کے لئے چائے بنارہی تھی۔ جب موقع دیکھتے ہی ریم پانی کا گلاس رکھنے کے بہانے وہاں نمودار ہوئی۔ اس کے مر جھائے ہوئے چہرے نے اس کے دل کو تسلیکین دی تھی۔ اس نے آہستگی سے گلا کھنکارا۔

"الگتا ہے تم میری انٹرنیشنپ کی خبر سن کر خوش نہیں ہوئیں جاناں"

اس نے گلاس سنک میں رکھتے ہوئے کہا تو جانان کا پنیلے میں چج گھماتا ہاتھ ساکن ہو گیا۔ تیز نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

"میں تمہاری ان مکاریوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تم سے میری خوشی برداشت نہیں ہوتی۔"

اس نے بمشکل اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔ گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ کسی بھی قسم کی بدمزگی خاندان میں باقی بننے کی وجہ بن سکتی تھیں۔

"مجھے تم سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا جانان"

رمیم کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ ابھری تھی۔

"انٹرنیشپ کی ای۔ میل تو مجھے پرسوں ہی مل گئی تھی۔ پھر میں نے سوچا۔ آج تمہارا اتنا بڑا دن ہے۔ تم یقیناً بہت خوش ہو گی پھر کیوں نہ تمہاری خوشی کو آدھا کیا جائے۔"

اس نے شانے اچکاتگ ہوئے سلیپ سے ٹیک لگائی۔

"افسوس ریم تمہیں سب کی توجہ حاصل کرنے کے لئے اس طرح کے اوچھے اور پنج حصے اپنا نے پڑتے ہیں۔ ورنہ تمہاری شکل اور عقل اس قابل نہیں کہ کوئی تمہیں کوئی گھاس بھی ڈال دے"

جانان نے اُس کی ڈکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب کے سلمان مر نصی"

رمیم کے چہرے کا رنگ بدلا اور جانان کا انداز۔

"جس کی تھوڑی سی توجہ کے لئے تم کس طرح سے پاپڑ بیتی ہو۔ تم چھلو کی طرح اس کے اگے پچھے گھومتی ہو مگر افسوس، تم چاہے کیوں نہ زمین آسمان ایک کر دو۔ سلمان مرتضی تھیں کبھی نہیں ملے گا۔"

جانان نے ہلاکا سا جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ چائے اُبل کر پتیلے سے باہر گر چکی تھی۔ ریم کئی لمحوں تک اُسے دیکھتی رہی۔ لبوں پر جیسے قفل لگ گئے تھے۔
"یو ور لیبلیو ٹلی رائٹ ریم، تھیں مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔۔۔ او نہوں"

جانان نے ہنکارا بھرا اُس کے گال کو نرمی سے تھپکا اور تنفر سے اس پر ایک آخری نگاہ ڈالتے ہوئے۔ چائے کی ٹرے لیکر کچن سے باہر چلی گئی۔ جبکہ ریم بیگ اپنی ٹھنڈی ہٹھیلیوں سمیت وہاں کھڑی رہ گئی تھی۔ ایسا لگا کسی نے گرم چائے اُس کے منہ پر دے ماری ہے۔

"سلمان بے شک مجھے نہ ملے جاناں لیکن اب وہ تھیں بھی نہیں ملے گا۔"
سلیب کا کنارہ سرکشی سے بھینچتے ہوئے۔ اس نے خود سے عہد کیا تھا۔



BEING THE STRING OF YOUR KITE

"مبارک ہو مس جاناں"

عرفات بلکل اُس کے پچھے کھڑا تھا۔ سیاہ رنگ کی شلوار قمیض پر سفید رنگ کا واسکٹ پہنے، آنکھوں میں نرم سا تاثر لئے وہ جاناں کو وارفتگی سے دیکھ رہا تھا۔

"باجی ۔۔۔ جاناں باجی کہہ کر ملا یا کرو۔ مت بھولو میں عمر میں تم سے ساڑھے پانچ سال بڑی ہوں"

اس کی آواز میں ناجانے ایسا کیا تھا۔ جسے سُنتے ہی جاناں کا بلیڈ پریشر تیزی سے بڑھ جاتا تھا۔

"اچھی خاصی شکل و صورت ہے تمہاری، لکھتی بھی اچھا ہو۔ بول بھی اچھا لیا کرو۔"

عرفات کا تو منہ ہی لٹک گیا تھا۔ جانان کی تمام تر بے رُخی ایک طرف مگر جب وہ اُس پر اپنی عمر کا رب جھاڑتی تھی۔ اس کا دل عجیب ہونے لگتا تھا۔

"میں زہر کھالوں گا مگر تمہیں باجی کبھی نہیں کھوں گا"

"تو پھر بہتر ہے کہ تم زہر ہی کھالو۔ میرے ساتھ ساتھ تمہارے ماں باپ کی بھی جان چھوٹ جائے گی تم سے"

"جانان میری بات سنو"

عرفات نے مضطرب ہو کر اس کا راستہ روکا۔

"یہاں تماشہ مت لگاؤ لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

اس نے کن اکھیوں سے اطراف میں دیکھتے ہوئے بادل ناخواستہ ہلاکا ہما مسکرا کر سرگوشی میں کہا۔

"تم مجھ سے ہمیشہ خفا کیوں رہتی ہو جان ۔۔۔۔۔ تم مجھے بتاؤ تمہیں کیا پسند ہے۔ میں وہ ساری عادتیں اپنا لوں گا۔"

اس کی بے اعتنائی سے وہ بے چین ہوا تھا۔

"خفا ان سے ہوتے ہیں۔ جن سے کوئی امید یا رشتہ ہوتا ہے۔ مجھے نہ تو تم سے کسی قسم کی کوئی امید ہے اور نہ کوئی رشتہ اور جہاں تک بات ہے۔ میری پسند میں ڈھلنے کی تو ایک بات کان کھول کر سن لو عرفات بیگ تم اگر سونے کے پانی سے بھی نہا کر آ جاؤ تو میں تمہیں ہر بار اتنی ہی بے رُخی سے رد کروں گی۔"

استہزاۓیہ مسکرا کر کہتی وہ گویا بہت کچھ جتا گئی تھی۔ عرفات کے سینے میں ہوک سی اٹھی۔

وہ تلوار جیسی زبان سے عرفات کے دل کے ٹکڑے کرتی رُخ پھیر گئی۔ بچپن سے اب تک یہی تو ہوتا آیا تھا۔ وہ جتنا اس کے قریب جانے کی کوشش کرتا۔ جاناں اُتنا اُس سے دور بھاگتی۔

عرفات بیگ، ریم کا چھوٹا بھائی تھا۔ جتنی ناپسند اُسے ریم تھی۔ اس سے کہیں زیادہ بُرا اُسے عرفات لگتا تھا۔ اور اُسے 101 فیصد یقین تھا کہ ریم کو بھی وہ اتنا ہی ناقابل قبول ہو گا۔ لیکن اپنے سوتیلے باپ کی اس بیکار اولاد کو جھیلنا اُس کی مجبوری تھی۔ مگر جاناں۔۔۔ اُس کی تو ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ اور اگر ایسی کوئی مجبوری ہوتی بھی تو وہ اس قسم کا عذاب کبھی برداشت کرتی۔

جاناں کو عرفات پر بھڑکتے زریں نے دور سے دیکھ لیا تھا۔ ان کے چہرے پر فکرمندی کے تاثرات نمودار ہوئے تھے۔ وہ جاناں کے سرد، کٹھور اور سنگ دل رویے سے کافی پریشان رہتی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ جاناں کے اندر کڑواہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ ان سب میں قصور اُس کا نہیں تھا۔ اُس کا بچپن ہی اتنا تلخ گزرا تھا کہ وقت کے ساتھ اس کی فطرت میں تلخی گھلتی چلی گئی تھی۔

"پریشان مت ہو زریں وقت کے ساتھ سب بدل جائے گا"

سارہ نے اپنی بہن کے کندھے پر آہستگی سے ہاتھ رکھ کر اُنہیں دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

"اتنا وقت تو گزر گیا ہے سارہ باجی اور کتنا وقت لگے گا۔"

ان کی آنکھوں کے سامنے ماضی کے نشیب و فراز چلنے لگے۔ کچھ اذیتیں وقت کے ساتھ بھی کم نہیں ہوتیں۔ کچھ زخم تا حیات تازہ رہتے ہیں۔ کچھ یادیں کالے سائے کی طرح آپ پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ کچھ ماضی کبھی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

زرمیں سبزداری نے سرد آہ بھرتے ہوئے۔ تاریک آسمان پر ٹھٹھماتے تاروں کی جانب دیکھا۔

☆...☆...

یہاں سے چند میل دور واقع قصر بیگ کے گراونڈ فلور پر موجود لاوچ میں اس وقت کافی اندھیرا تھا۔ ملازم اپنا کام کر کے سرونٹ کوارٹر میں جا چکے تھے۔ اور اس وقت پورے گھر میں وہ اکیلی چادر اپنے گرد لپیٹے صوفے پر پاؤں اوپر کر کے بیٹھی تھی۔ سامنے ٹی وی پر کوئی ٹاک شو چل رہا تھا۔ سینٹر ٹیبل پر اسنیکس سے بھری ایک ٹرے رکھی تھی۔ موسم سرد نہیں تھا مگر ریم بیگ کو پھر بھی ہلکی ہلکی ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ کیونکہ وہ ابھی ابھی شاور لیکر نکلی تھی۔ رات کو نہانا اس کی بُری عادتوں میں سے ایک عادت تھی۔

نمی سے چمکتے بالوں کو اس نے صوفے کی پشت پر ڈال رکھا تھا۔ جس کے سرے سے پانی کی ننھی منی سی بوندیں سنگ مرمر کے فرش پر گر رہی تھی۔ سیاہ ٹراؤزر کے اوپر اس نے جان بوجھ کر عرفات کے فیورٹ برینڈ کی ٹیشرٹ پہن رکھی تھی۔ کیونکہ اس نے ریم کا لیپ ٹاپ ری سیٹ کر دیا تھا۔ جس وجہ سے اس کی مہینوں کی محنت بر باد ہو گئی تھی۔ اس کے نئے ناول کی فائل ڈیلیٹ ہو گئی تھیں۔ چھے وہ لاکھ کوششوں کے باوجود بھی بازیافت نہیں کر سکی تھی۔ اس نے ایسا محض ریم کو تنگ کرنے کے لئے کیا تھا۔

سو آج بدلا لینے کی باری اس کی تھی۔ اور اس سے اچھا موقع کیا ہو سکتا تھا کہ وہ عرفات کی غیر موجودگی میں اس کی وارڈروب سے اس کی پسندیدہ شرٹس نکال کر پہنے اور پھر جان بوجھ کر اس پر جوس یا سالن گرا کر اسے خراب کر دے۔

اس نے بیزاری سے چینل بدل دیا۔ اسکرین پر اس شخص کی شکل نمودار ہوئی۔ جس سے وہ آج کی تاریخ میں سب سے زیادہ نفرت کرتی تھی۔ نیوز چینل پر جانان سبزداری کی بُک لاوچ

کی تقریب کے مناظر چل رہے تھے۔ جس میں وہ مختلف جرنلسٹ کے سوالات کے جوابات دیتی دکھائی دے رہی تھی۔ ایک دم، ہی ایک سال پہلے کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔



جانان لوگوں کی بھیڑ سے الگ تھلگ مضبوط اور تناور درخت کے سامنے میں جوس کا گلاس بے دلی سے تھامے کھڑی تھی۔ اگر زرینہ اُسے زبردستی یہاں آنے پر مجبور نہ کرتی تو وہ مر کر بھی اس تقریب میں شرکت نہیں کرنے والی تھی۔ اس کی نظر استیح پر موجود ریم پر گئی۔ آسمانی رنگ کی فلورل شلوار قمیض پر بالوں کو شانوں پر پھیلائے۔ وہ شیشے کا چمکتا ہوا ایوارڈ تھامے سارہ بیگ کے ساتھ کھڑی تصویریں کھچوانے میں مصروف تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایوارڈ دیکھ کر جاناں کی آنکھوں کا نور بُجھ گیا۔ اُس نے بیزاری سے نظریں دوسری جانب پھیر لیں۔ اس کا دل دنیا کی ہر نعمت سے اچاٹ دکھائی دے رہا تھا۔

ایسا کیا تھا اس کی کہانیوں میں جو جاناں کی کہانی میں نہیں تھا۔ حالانکہ اس کے ناویں خواتین ڈائجسٹ جیسے نامور ڈائیجسٹ میں شائع ہو چکے تھے۔ اور پچھلے دو سالوں سے وہ اس کا پیشہ میں حصہ لے رہی تھی۔ مگر وہ بیسٹ رائٹر کی فہرست میں اپنا نام شامل کروانے میں ناکامیاب رہی تھی۔ دوسری جانب ریم کا ناول پہلی کوشش میں ہی مقابلے میں منتخب ہو گیا تھا۔ کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ ریم کی اس کامیابی نے جاناں کو تکلیف کے کس دلدل میں دھکیل دیا تھا۔

"یہاں اکیلی کھڑی اپنی ناکامی کا سوگ منا رہی ہو ڈیز سسٹر؟"
اچانک عقب سے ریم کی آواز اُبھری تھی۔ جاناں ٹھٹھک کر پیچھے ہوئی۔

"تم سوچ رہی ہوگی کہ ہر جگہ میرے ناول کا ہی ذکر ہے۔ ہر کوئی میرے بارے میں ہی بات کر رہا ہے۔ ہے نال؟"

ریم نے مسکرا کر اپنے ہاتھ میں موجود ایوارڈ کی جانب دیکھا۔ جس پر سنہرے حروف میں اُس کا نام لکھا تھا۔

"نمکم وقت ہے۔ اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے۔ آج تم اُپر ہو۔ یہ وقت تمہارا ہے۔ اپنی کامیابی کا لطف اُٹھاؤ مگر یہ ہرگز مت سمجھنا کہ میں نیچے بیٹھ کر روٹیاں سیکھ رہی ہوں۔ میں اپنے زوال میں اپنا عروج لکھ رہی ہوں۔ اور یہ میرا"

انگشت شہادت سے اپنے سینے پر دستک دی۔

"جانان سبز واری کا تمہیں چیلنج ہے کہ اگلے سال میرا نام ٹھیک وہاں سب سے اوپر لکھا ہو گا۔"

انگلی سے اسٹیچ کی پشت پر موجود بڑی سی اسکرین کی جانب اشارہ کیا۔ جہاں بیسٹ رائٹر کا نام لکھا تھا۔ جہاں ریم بیگ کا نام لکھا تھا۔
"یاد رکھنا"

"تم لکھو گی اپنا عروج ۔۔۔ ہاں؟ کیسے لکھو گی بتاؤ؟ کمپیوٹر کو رسز کر کے؟
ریم نے مضائقے خیز انداز میں قہقہہ لگایا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے جانان تم دو چار کمپیوٹر کو رسز کر کے میری طرح جینیس بن جاؤں گی؟"
یہ بات پورا خاندان جانتا تھا کہ ریم کمپیوٹرز میں کتنی اچھی تھی۔ اور ماں سیکر و سافٹ کمپنی نے اس کی مہارت کو دیکھتے ہوئے۔ اس کی انٹرن شپ کی درخواست فوری طور پر قبول کر لی تھی۔

"ہم دونوں میں بہت فرق ہے ریم"

اس کے چہرے پر ایک مدھم سی مسکراہٹ ابھری تھی۔ یہ مسکراہٹ بہت الگ تھی۔ کچھ عجیب سی---!!

"کیا فرق ہے؟"

ریم نے طنزیہ استفسار کیا۔

"اس کا جواب میں تمہیں ایک سال بعد دوں گی وہاں بیٹھ کر" نظروں سے اسٹپ کی جانب اشارہ کیا۔ جس کے بلکل سامنے ایک قطار میں اسٹینڈ پر جرنسلٹ کے کیمرے موجود تھے۔

☆...☆...☆

"اندھیرے میں بیٹھ کر خواب دیکھنے سے خواب سچ نہیں ہو جاتے ریم عرفات لاوچ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ دیوار پر ہاتھ مار کر تمام لائٹس روشن کرتے ہوئے۔ وہ بلند آواز بولا۔ ریم نے جھنجھلا کر آنکھیں بند کیں۔ عرفات کی اس حرکت نے اُس کے خیالوں میں زبردست خلل ڈالا تھا۔" "بکواس بند کرو اور لائٹ بھی"

اس نے کشن کھینچ کر مارا جسے عرفات نے بروقت کچ کر لیا۔ ٹی وی کا چینل بدلتے ہوئے۔ وہ ریم کے اسنیکس پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ ریم نے خفگی سے اُسے دیکھا پھر یکدم گردن گھما کر وال کلاک پر نظر ڈالی۔ وہ تقریب سے اتنی جلدی واپس آگیا تھا۔ وہ بھی اُس تقریب سے جو خاص طور پر جانان کے لئے منعقد تھی۔

"میں اتنا پسند آگیا ہوں تمہیں جو مجھ پر نظریں جمائے بیٹھی ہو؟" ریم کی تسلسل سے دیکھتی نظروں نے اُسے پریشان کیا تھا۔

"لگتا ہے آج پھر ٹھیک ٹھاک بے عزتی کا سامنا کرنا پڑا ہے تمہیں" وہ اپنے گرد چادر ٹھیک کرتے ہوئے سمت کر پیٹھ گئی۔

"ڈکھی تو تم بھی اچھی خاصی ہو۔"

"میں کیوں ڈکھی ہونے لگی۔"

اس نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔

"ایک بار پھر سے رسپلیس جو کر دیا ہے تمہیں جاناں نے"

وہ ہنوز تُلی وی اسکرین پر نظر جمائے بولا۔

"نیند سے جا گو عرفات، وہ میری جگہ نہیں میرے بعد کھڑی ہے۔ بلکل میرے پیچھے۔"

اس کے لمحے میں امدادتے غصے کو محسوس کرتے ہوئے عرفات نے گردن ترچھی کر کے ریم کے

سرخ ہوتے چہرے کو دیکھا۔

"وہ تمہیں گھاس تک نہیں ڈالتی اور ایک تم ہو جو دم چھلے کی طرح اس کے آس پاس گھوٹنے رہتے ہو۔"

"اپنے احساسِ مکتری کی بندوق دوسروں کے کندھوں پر رکھ کر چلانا چھوڑ دو ریم"

وہ طنزیہ بولا۔

"اگر تم میرے لیپ ٹاپ سے دور رہتے تو آج لوگوں کی توجہ کا مرکز ریم بیگ ہوتی۔ وہ دو ٹکے کی کاپی کیٹ جاناں نہیں سمجھے۔"

وہ انگشت شہادت کا رخ اس کے جانب کرتے ہوئے زہریلی ناگن کی طرح پھنکاری۔

"تمہیں سایہ کا یئرست کی ضرورت ہے ریم --- احساسِ مکتری اور اکیلے بن نے تمہیں پوری

طرح سے پاگل کر دیا ہے۔ اس سے پہلے کہ تم اپنا دماغی توازن کھودو، کسی اچھے سے

سائیکائیٹر سٹ سے اپنا علاج شروع کروا دو۔ ورنہ تم بھی اپنے میگنیٹر داور کی طرح کسی دن اللہ میاں کے پاس پہنچ جاؤ گی۔"

یہ الفاظ تھے یا تیزاب ریم بیگ کے وجود کو چھلنی چھلنی کر گئے تھے۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ہی میری وجہ سے اللہ کے پاس پہنچ جاؤ"

وہ جھٹکے سے صوف سے اٹھی تو چادر پھسل کر زمین پر گر گئی۔ ریم کو اپنی فیورٹ لی شرط میں دیکھ کر عرفات کا پارا ہائی ہوا۔ اُس کے چہرے پر پریشانی دیکھ کر جیسے ریم کو اپنی روح تک سکون اُرتتا محسوس ہوا تھا۔

"تم نے پھر میرے کپڑوں کو ہاتھ لگایا۔"

وہ ریمورٹ سینٹر ٹیبل پر پٹختا کھڑا ہوا گیا۔ اتنی دیر سے وہ چادر لپیٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ جس وجہ سے عرفات دیکھ نہیں سکا تھا۔

"یہ تو بدلا ہے عرفات اب بھول جاؤ تم اپنی اس لی شرط کو"

وہ فوراً اوپر اپنے کمرے کی جانب دوڑی تھی اور عرفات اس کے پیچے تھا۔ اس نے جو کہا تھا۔ وہی ہوا اگلے دن عرفات کو اپنی لی شرط بیچ میں سے کٹی ہوئی اپنے کمرے کے ڈسٹ بن میں ملی تھی۔



ڈیفینس آفیسرز ہاؤسنگ سوسائٹی میں موجود اس درمیانے درجے کے بنگلے کی بالائی منزل پر موجود اس ماسٹر بیڈ روم کی بڑی سی کھڑکی کے باہر صحیح چمک رہی تھی۔ مگر یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی دن شروع ہی نہیں ہوا ہے۔ کرب و جوار میں بلکل سناتا تھا۔ یہ کراچی تھا۔ جہاں دن کا آغاز آدھا دن گزرنے کے بعد ہوتا تھا۔

باہر سے روم کے اندر جھانک کر دیکھو تو ذوالکفل ڈی آئی جی صاحب سے ملنے کے لئے اپنے پولیس یونیفارم میں نک سک ساتیار نظر آرہا تھا۔ لمبا دراز قدم، فوجی کٹ ہمیر اسٹائل اور چہرے پر گھری کالی آنکھیں اس کے وقار میں اضافہ کر رہی تھیں۔

چھوڑے خوبصورت شانوں پر چاندی کے ستارے فخر سے چمک رہے تھے۔ اور ایسی ہی چمک اس کی آنکھوں میں تھی۔ بندوق کو ہولسٹر میں اڑستے ہوئے۔ ذوالکفل نے کلامی پر گھٹری باندھی۔ اس نے بستر پر رکھی ٹوپی اٹھا کر اپنے سر پر جمائی۔

بالائی منزل کے زینوں کو عبور کر بینگلے کے گراونڈ فلور پر واقع کچن میں آؤ تو بیشن سکندر ناشتے کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ چیز آمیٹ کی خوشبوں پورے لاوچ میں پھیلی ہوئی تھی۔ بیلا جاؤں ناشتہ ٹیبل پر لگا دو ذوالکفل ناشتے کے لئے نیچے آنے والا ہو گا۔

ملازمہ پر حکم صادر کر کے وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کر تیں کچن سے باہر آئیں تو لاوچ سے ملحقة سیڑھی پر ذوالکفل انہیں جلدی جلدی زینے اُرتتا نظر آیا۔

"ڈی ایس پی صاحب اپنی طرین کی چین کھینچو اور چپ چاپ ناشتے کی ٹیبل پر نظر آؤ مجھے" انہوں نے مصنوعی بھرم جھاڑا

"والدہ محترم ڈی آئی جی صاحب میراویٹ کر رہے ہیں۔ میں تھانے میں ناشتہ کرلوں گا۔" اس نے معقول وجہ پیش کی تھی مگر بیشن سکندر کی عدالت میں اُسے بیل مل جاتی ایسا ہرگز ممکن نہیں تھا۔

"اپنے ڈی آئی جی صاحب سے کہنا ہوم منستر کا آرڈر تھا کہ بنا ناشتہ کئے گھر سے قدم باہر رکھا تھا تو ہمیشہ کے لئے سسپنڈ کر دیا جاؤں گا۔ اور ویسے بھی جو ذاتقہ میرے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے میں تمہیں ملے گا۔ وہ پولیس اسٹیشن کی چائے میں نہیں ملے گا۔"

اُنہوں نے مسکرا کر کرسی کھینچی تو ذوالکفل نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور دوسری کرسی کھینچ کر ٹیبل پر ناشتے کے لئے بیٹھ گیا۔ چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہی اس کے چہرے پر خوشگوار سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ "ٹھیک کہا آپ نے امی جو ذائقہ آپ کے ہاتھ کی چائے میں ہے۔ وہ پولیس اسٹیشن کی چائے میں نہیں۔"

بیٹھ کی بات پر وہ کھل کر مسکرائیں تھیں۔

"میں سوچ رہی تھی۔ اتنے سالوں بعد ہم کراچی آئے ہیں۔ کیوں نہ شام میں زریغہ بھاگھی کے گھر چلیں؟"

بیشن نے بوائل انڈے کو بھری کانٹے کی مدد سے کاٹتے ہوئے کہا۔

"جی بلکل آپ کو مامی جان سے ملنے ضرور جانا چاہئے مگر میں بہت مصروف ہوں۔ اس لئے میری طرف سے آپ ان سے معزرت کر لیجئے گا۔" اس نے چیز آمیلٹ منہ میں رکھا۔

"یہ کیا بات ہوئی تم اپنی پچھو سے ملنے نہیں چلو گے؟"

"امی آپ بے فکر ہو جائیں، میں مامی جان سے بعد میں مل لوں گا۔"

بیشن سکندر کے چہرے پر اُداسی چھاگئی۔ جسے دیکھتے ہوئے ذوالکفل کچھ مضطرب ہوا۔ "آپ کو پتا ہے میرا ٹرانسفر کراچی بہت اہم کیس کے سلسلے میں ہوا ہے۔ داور علی قتل کیس میرے لئے بہت زیادہ ضروری ہے۔"

اس کے ملتحیانہ انداز پر اُن کے کندھے ڈھلکے۔

"تم بکل اپنے ابو جیسے ہو ذوالکفل۔ سکندر کو بھی اپنے کام کے آگے کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ وہ بہت ایماندار پولیس آفسر تھے۔" اپنے شوہر کو یاد کرتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ "بکل میری طرح؟"

ذوالکفل نے جھک کر ان کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ مسکرا گئیں۔ "جی نہیں تم سے بھی کہیں زیادہ" اس کے سر پر محبت سے چپٹ لگائی۔

"یہ غلط بات ہے ویسے آپ نے ابو کے سوا کبھی میری تعریف نہیں کی حالانکہ میں بھی ابو سے کچھ کم نہیں ہوں۔" "تم تو میری زندگی جینے کی آخری وجہ ہو ذوالکفل" بیشن سکندر نے بے حد شفقت سے ذوالکفل کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ وہ بہت خوش قسمت تھیں کہ اللہ نے ان کے نصیب میں لکھے دونوں مردوں کو ان کا فرمابردار اور محبت کرنے والا بنایا تھا۔

سکندر خان نے 1984 میں سندھ پولیس فورس میں بطور اسٹینٹ سب انسپکٹر شمولیت اختیار کی تھی اور صوبائی مختص ہونے کی وجہ سے کراچی اور بلوچستان کے متعدد تھانوں میں خدمات بھی انجام دیں۔ وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کے قابل آفیسر تھے۔

2001 میں انہوں نے کراچی میں ٹارگٹ کلرز کے خاتمے کا کام حاصل کیا۔ جس کے فوراً بعد انہیں اس ایل ٹی ایف) لیاری ٹاسک فورس (کی قیادت کرنے اور لیاری ٹاؤن میں گینگ وار کو ختم کرنے کے مشن پر معمور کیا گیا۔

2005 میں، سکندر خان کو اسلام آباد ٹرانسفر کر دیا گیا۔ جہاں انہیں کر منل انویسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ میں انویسٹی گیشن ونگ کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ وہاں ایمانداری سے اپنی ڈیوٹی نبھانے کے بعد وہ دو سال لاہور میں بھی رہے۔ جس کے بعد سکندر خان کو 2009 کے 1 لیاری گرینڈ آپریشن میں اپنی کارکردگی کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی۔ جس کا مقصد ایک بار پھر جرامِ پیشہ افراد کے علاقے کو صاف کرنا تھا۔

وہ 9 جنوری 2010 کی شام تھی۔ سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا تھا۔ بنیش سکندر ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر کچن میں لنج کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ سکندر خان نے اس روز فرماش پر کڑی چاول بنوائے تھے۔ لاونچ میں بیٹھا ذوالکفل ہی وی پر نیوز دیکھ رہا تھا۔ ابھی وہ چاولوں کو دم پر رکھ کر سکندر خان کو کال ملانے کے لئے باہر آئیں ہی تھیں کہ ہی وی پر نیوز اینکر نے دل دھلانے والی خبر پڑھنا شروع کی۔

"کراچی کے علاقے عیسیٰ نگری میں دہشت گردوں نے آج پھر خون کی ہوئی کھیلی، لیاری ایکسپریس کے قریب ایس ایس پی، سی آئی ڈی سکندر خان کی گاڑی کو نشانہ بنایا گیا۔ دھماکے میں سکندر خان اور سکواڑ کے تین الہکار شہید ہو گئے۔ بم دھماکے میں ایس ایس پی، سی آئی ڈی کی گاڑی اور پولیس موبائل سمیت تین گاڑیاں تباہ ہو گئیں۔"

بنیش خان کے ہاتھوں میں کپکپی سی طاری ہوئی۔ انہوں نے ایک نظر موبائل اسکرین پر چکتے نمبرز کو دیکھا اور پھر سامنے ٹی وی چینل پر چلتے مناظر کو۔ ذوالکفل نے بنیش کو بازوؤں

سے پکڑ کر صوف پر بٹھایا۔ وہ خاموشی سے گنگ سی لی وی اسکرین کو گھور رہی تھیں۔ ابھی چند لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ رشتے داروں کے فون کالز کا سیلاپ آگیا تھا۔ سکندر خان کی موت ان کی زندگی کا سب بڑا دھچکا تھی۔ جس کے بعد وہ طویل عرصے تک بیمار رہیں۔

انویسٹیگیشن کے بعد معلوم ہوا تھا کہ سکندر خان کو ٹی ٹی پی کے خلاف کارروائیوں کے باعث نشانہ بنایا گیا تھا۔

سکندر خان اپنے وقت کے ایماندار اور رعب دار پولیس آفسر تھے۔ انہوں نے پاکستان پولیس سروس کو اپنی زندگی کے چھبیس سال دیئے تھے۔ وہ جتنے سال سروس میں رہے۔ بنا ڈرے کسی کے دباؤ میں آکر انہیں نے اپنی ڈیوٹی سر انجام دی۔

ذوالکفل نے سکندر خان کی المناک موت کے کچھ عرصے بعد ہی پولیس سروس میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ وہ بہت کم عرصے میں ہی ملکہ پولیس میں اپنے بے باک انداز اور بہترین کارکردگی کی وجہ سے سینیسر افسران کی نظر وہ میں آگیا تھا۔ جہاں کچھ لوگ اس کے کام سے خوش تھے تو وہیں کچھ لوگوں کو ذوالکفل سکندر خان بہت بری طرح سے چھبتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُسے کراچی سے لاہور ٹرانسفر کر دیا گیا۔

وہ بلاشبہ ایک قابل اور ذہین پولیس آفیسر تھا اور اُسے یہ ذہانت اور بہادری اپنے والد سکندر خان سے ورثے میں ملی تھی۔



زرمینہ سبز واری جانان کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آئیں تو وہ انہیں ہمیشہ کی طرح اپنی اسٹڈی ٹیبل پر بکھری کتابوں پر سرٹکائے سوتی ہوئی ملی، ٹیبل کے سامنے موجود کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ جس کے پڑ بامگلی میں کھلتے تھے۔

کھڑکی سے آتی ہوا جانان کے بالوں سے الجھ رہی تھی۔ پڑوسیوں کے بچے اسکوں یونیفارم میں تیار کھڑے اپنی دین کا انتظار کر رہے تھے۔ پرندے بھی اپنے گھونسلوں سے رزق کی تلاش میں نکل پڑے تھے۔ مرد حضرات گھر سے آفس کی جانب گامزن تھے۔

زرمینہ کھڑکی سے باہر نظر ڈالتے ہوئے۔ ٹیبل پر بکھریں کتابیں سمیٹنے لگیں تو ہاتھ لگنے سے ٹیبل پر رکھا پلاسٹک کا پین ہولڈر زمین پر گر گیا۔

جس کے شور سے ٹھٹھک کر جانان کی نیند ٹوٹ گئی۔ اس نے خمار آلود آنکھوں کو بمشکل واکیا۔ وہ رات دیر تک ناول لکھتی رہی تھی۔ کب اس پر نیند غالب ہوئی پتا ہی نہیں چلا۔ "دن بھر اپنی پی اتچ ڈی کی پڑھائی میں مصروف رہتی ہو اور رات دیر تک لکھتی رہتی ہو۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

وہ پیار سے اُسے جان کہتی تھیں۔

"کچھ نہیں ہوتا مجھے، میں بہت ڈھیٹ ہوں۔ اتنی جلدی موت نہیں آئے گی۔"

وہ کسل مندی سے آنکھیں مسلتے ہوئے بولی

"ہر وقت ایسی باتیں کرنا ضروری ہے؟"

زرمینہ سبز واری کی آنکھوں میں خفگی ابھری۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے اُسے دیکھتی رہیں پھر گھری سانس پھیپھڑوں میں اتارتے ہوئے تامل سے بولیں۔

"تمہاری لاہور والی بینیش پھپھو کر اچی آگئی ہیں۔"

"کس خوشی میں؟"

جانان بالوں کا جوڑا بناتی کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر کوئی رنگ نہیں تھا۔

"اُن کے بیٹے ذوالکفل کا یہاں ٹرانسفر ہو گیا ہے۔"

وہ جلدی جلدی اپنا کمرہ سمیٹ رہی تھی۔ زرینہ نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کے پٹ مقفل کر دیئے۔

"تمہاری پچھو آج شام کو چائے پر آ رہی ہیں"

یہ خبر سُنتے ہی جنان کے پھرتی سے چلتے ہاتھ سُست ہوئے۔ اس نے پلٹ کر اپنی ماں کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا۔ زرینہ نے نجالت سے نظریں پھیر لیں۔

"اتنا سب ہونے کے باوجود بھی آپ اس خاندان سے رابطہ بحال رکھنا چاہتی ہیں امی؟"

وہ بہت ضبط سے مٹھیاں بچینچ کر بولی۔ بچپن کی یادوں نے اس کے گرد طواف کرنا شروع کر دیا تھا۔

"بیٹا رشتہ آسانی سے ختم نہیں ہوتے اور تمہارے باپ نے جو کچھ بھی کیا۔ اس میں بینش کا کیا قصور ہے۔ وہ تو تم سے بہت محبت کرتی ہیں۔"

"وہ آپ کے شوہر کی بہن ہے اتنی وجہ معقول ہے۔ اور اس شخص سے جڑا ہر شخص مجھے ناقابل قبول ہے۔"

غصے سے پاؤں پٹختی وہ ہاتھ روم میں گھس گئی۔

زرینہ نے افسوس سے ہاتھ روم کے بند دروازے کو دیکھا۔

اجلال کو گزرے بیس سال سے اوپر ہو گئے تھے مگر ان کے ساتھ گزری وہ تلخ یادیں آج بھی

زندہ تھیں۔ جنان نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ اپنے باپ کو چھنٹے چلاتے اور اپنی بیوی کو

بے رحمی سے مارتے پیٹے دیکھا تھا۔ ان کا گھر عام لوگوں کے گھر جیسا کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ اس گھر سے ہمیشہ گالیوں اور شور شرابے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

برتنوں کے ٹوٹنے کی آوازیں اور اپنی ماں کی سسکتی آہوں کے درمیان جانان سبز واری نے اپنی آنکھیں کھوئی تھیں۔

اجلال خان ایک سرپھرے، عیاش اور خود غرض انسان تھے۔ زرینہ اُن کی جتنی بھی خدمت کر لیتی، بے شک ان کے جو توں پر اپنی ناک ہی کیوں نہ رگڑ لیتیں مگر اجلال خان کبھی بھی ان کی خدمتوں سے خوش نہ ہوتے۔ ان کی نظر میں وہ ایک بیکار اور پھوہڑ عورت تھیں۔ جوز بردستی اُن کے باپ نے اُن کے سر پر مُسلط کر دی تھیں۔

جو حق اللہ نے دیا وہ حق والدین نام کی مخلوق نے چھین لیا۔ والدین کی فرمابرداری کی آڑ میں خود ماں باپ ان سے اپنی مرضی سے شادی کرنے کا حق چھین کر اپنے بچوں کی زندگیاں بر باد کر دیتے ہیں۔ اللہ کے ایک حکم کو دوسرے حکم سے بدل کر انسان کو مینیو پلیٹ کرتے ہیں۔ اور پھر دھڑلے سے کہتے ہیں۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔۔۔ پتہ نہیں اللہ کو ماننے والے اللہ کی کب مانے گے۔

جانان کا بچپن باقیوں کے بچپن سے بہت مختلف تھا۔ وہ کھلونوں سے نہیں کھیلتی تھی۔ اس کا باپ اس کا رول ماؤل نہیں تھا۔ وہ اپنے پاپا کی پری نہیں تھی۔ ان لوگوں نے کبھی بھی ایک نارمل فیملی کی طرح ایک ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ لوگ سیر سپاٹوں پر نہیں جاتے تھے۔ اس گھر میں ماں باپ نہیں رہتے تھے۔

شاور کے نیچے دیوار سے ٹیک لگائے جانان آنکھ بند کر کے گھٹنوں میں سردے کر بیٹھی ہوئی تھی۔ کانوں میں برتن ٹوٹنے کا شور، سسکیوں اور چیخنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اجلال خان

نے اس گھر کو جہنم بنا دیا تھا۔ وہ جہنم جس کی آگ اتنے سالوں بعد بھی جاناں کے اندر دھک رہی تھی۔

اگر آپ کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہی آپ کا دل توڑ دے تو پھر وہ دل کوئی دوسرا مرد نہیں جوڑ سکتا۔ خاص طور پر جب وہ مرد اس کا باپ ہو۔ باپ کے دیئے ہوئے زخم کبھی نہیں بھرتے۔

باہر کھڑی زریمنہ جانتی تھیں کہ آج وہ لمبے وقت تک نہانے والی ہے۔ جو آگ اس کے اندر لگی ہے۔ اُسے شانت ہونے میں کچھ تو وقت لگنا تھا۔ وہ خاموشی سے جاناں کے کمرے کا دروازہ مقفل کر کے باہر آگئیں۔ وہ تقریباً دو گھنٹے بعد کمرے سے یونیورسٹی جانے کے لئے تیار ہو کر نکلی تھی۔ سیاہ ٹراوزر پر اس نے سیاہ رنگ کی فل آستین کی گرتی پہن رکھی تھی۔ بالوں کو ہالف کپچر میں مقید کر رکھا تھا۔ زریمنہ نے دیکھا اُس کا چہرہ بلکل سپاٹ تھا۔
"آج واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ میرا انتظار مت کبھے گا۔"

اس نے زریمنہ کے چہرے کی جانب دیکھنے سے اجتناب کیا۔ کیونکہ جتنی تکلیف جاناں نے برداشت کی تھی۔ وہ اس کا آدھا بھی نہیں تھا۔ جو زریمنہ سبزداری نے اپنی جوانی میں برداشت کیا تھا۔ خاموشی سے ٹیبل پر رکھیں گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ہوئے۔ وہ گھر سے باہر آگئی۔ آسمان کی سفیدی میں سورج کی پیلاہٹ گھل رہی تھی۔

تازی ہوا کے جھونکے نے اس کی طبیعت کو کافی حد تک بحال کر دیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اس نے اپنے گھر کے بلکل سامنے والے گھر پر نظر ڈالی مہرین کے کمرے کی کھڑکی کا پٹ

وا تھا۔ خلاف توقع وہ کھڑکی پر موجود نہیں تھی۔ شاید آج اُس کے گھر کا ماحول بھی سرد تھا۔
وہ کچھ سوچتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

جاری ہے۔۔۔

باقی آئندہ قسط میں



بِل صر اڑا ط

عنیزہ نراہد

"تم مجھے ایک برا انسان سمجھتی ہونا۔ مجھے پہچاننے میں تم سے ذرا سی غلطی ہو گئی۔ میں صرف برائیں، ایک بد ترین انسان ہوں۔" وہ گلاس میں شراب انٹی لیتے ہوئے ایک ٹرانس میں کہہ رہا تھا۔ شراب گلاس سے باہر گرنے لگی تھی پر اسے تو جیسے ہوش ہی نہیں تھا۔ پھر اس نے وہ گلاس اٹھایا اور اسکی طرف دیکھا۔

وہ خوف سے اپنی جگہ پر سمی۔ "کیا کہہ رہی تھی تم؟ اس وقت تمہارا کوئی موڈ نہیں ہے مجھے جیسے شرابی کے منہ لگنے کا؟" وہ خود سے سوال کرتا، خود سے جواب دیتا اس کے قریب بیٹھا۔ اور یہ کہ میں نشیں ہوں؟ آج تمہیں بھی شراب کی لذت پکھا دیں گا۔" اس نے گلاس منال کے منہ کے قریب کیا۔

☆☆☆

اکبھی تو تو بھی محبت کرے گا۔'

فاران احمد نے محبت کی تھی!

اتو بھی کسی کو ٹوٹ کر چاہے گا۔'

اس نے بھی کسی کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔

اور پھر۔۔۔ پھر وہ تجھے چھوڑ جائے گی۔'

اور پھر وہ اسے توڑ گئی۔

'اپھر میں تیرے پاس آؤں گا۔ اور کہوں گا کہ دل پر مت لے۔ وہ چلی گئی تو کیا ہوا، کوئی اور آجائے گی۔' اسکے جانے کے بعد کوئی نہیں آیا۔ اس نے آنے والے دیا۔

[Click here](#)

لیسن ٹھن

اب انتیاں

"بیہاں دستخط کرو غازہ !" کاغذ غازہ کے سامنے کرتے ہوئے انہوں نے کہا تو غازہ نے ایک نظر اپنے سامنے بیٹھے اس انجینی شخص کو دیکھا جس سے ابھی وہ چند گھنٹوں پہلے ملی تھی۔ ان چند گھنٹوں کی ملاقات نے اس شخص کو اس کا مختار بناؤالا تھا۔ زندگی میں پہلی بار قلم پکڑتے ہوئے غازہ کے ہاتھ بری طرح کاپنے تھے۔ وہ تو اسافی قلم تھام کر شفاف کاغذ پر اکڑھی تر پھی لکیریں کھینچ کر بہت سارے خاکے بنالیا کرتی تھی، کچھ حصہ دھنڈے ہوتے تو کچھ میں پہلی ہی جست میں جان موجود ہوتی۔

"میری رشتے کھونے سے ڈرتی ہو غازہ !" سیکر کا چند روز قبل کہا کیا جملہ کان کے پر اپھر اخفا۔ "جس کھاتا تھا نے میں رشتے کھونے سے ڈرتی ہوں سیکر ! اور یہ نیاد حسوار شہری شاید میں کھونے کے لیے ہی بناری ہوں۔" دل میں اس کے کہہ کا جواب دے کر اس نے کاغذ پر قلم گھسیا تھا۔ عجیب بات تھی وہ ایک کاروباری شادی کے لیے لہن بنی ہوئی تھی۔

☆☆☆

"میری زندگی بر باد کر کے تم بیہاں سکون سے سورہ ہو۔ شام سے میتو بھجے فون کر رہی ہے اور میں اس کافون نہیں اٹھا رہا جاتی ہو کیوں؟ کیوں کل میں اس سے بے دفائل کرنے پر بے دشمنہ ہوں۔ اپنی زندگی میں پہلی بار میں نے کسی کو جاہا ہے اور تم زبردستی ایک بڑا نسیل کی طرح میرے سر پر آگئی ہو۔" وہ بالوں میں باختہ چلاتا ہوا اپنے اندر کا سارا انتشار اس پر انتیل رہا تھا۔ غازہ خاموشی سے بس اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اسے واقعی ہی اس شخص پر ترس آیا تھا جس کی محبت آباد ہونے سے پہلے ہی کا باپ نے احجاز دی تھی۔ وہ بترے اتے کر اس کے نزد یک آئی تھی۔

"میں بہت تلخ ہو چکی ہوں لکھج ! جانتے ہو کیوں؟" اس نے اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے انتباہی آہنگی سے کہا

"کیوں نکہ اس دنیا اور معاشرے کی سفافی کے آپ کو تلخ نہادیتی ہے۔ اول تو مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم کسی سے کمینڈ ہو اور بالفرض اگر مجھے معلوم بھی ہو تا تو قتب بھی میں وہاں کچھ نہیں کر پاتی۔ میں یہ کاغذی تعلق تب بھی نہیں روک سکتی تھی۔ تمہاری مجرم میں نہیں ہوں گلچ ارسلان ! بلکہ اپنے مجرم تم خود ہو۔ میمن کے مجرم تم بوجو محض اپنے باپ کی لاٹھ کے ہاتھوں اپنی محبت پر ایک کاغذی سوتن لے آیا۔" وہ میںے پر بازو لپیٹے انتباہی تلخی سے کہہ رہی تھی جبکہ لکھج بس جیرت سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

تطمئن القلوب



انوشه آرزو

"جانے ہو میرے لیے اب محبت کیا ہے۔" وہ آنسوؤں کو بخکل روکے ہوئے تھی۔ "م جس سے (ال) مالک شروع ہوتا ہے، جس سے (ال) طیم شروع ہوتا ہے، جس سے (ال) باری اورت سے تھنا (وہ جو اللہ سے کی جاتی ہے) شروع ہوتی ہے۔۔۔ بس میں ہے میرے نزدیک محبت!" وہ بخطب کی انتہا پہ تھی۔ "ایک وقت تھام میری تھنا تھے مگر صرف ایک ہی تھنا ہے میری۔۔۔ اللہ۔۔۔ بس اللہ۔۔۔" وہ رکی اور گہر انسانی لے کر بولی۔ "ایک بار بھائی نے کہا تھا کہ ایک بار جو چڑھ جائے رنگِ حبِ اللہ تو اترتا نہیں۔۔۔ اب وہی رنگ چڑھ گیا ہے مجھے۔" وہ زید کی خاموشی بخشی کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔ اب ایک آخری جملہ رہ گیا تھا مجھے کہ وہ بہت پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کہنے لگی تھی کہ زید بولا۔ "تھنا تمہیں نہیں بھی ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تمہارا ہوں، تمہارا تھا، اور تمہارا ہوں گا۔ شوہر کی تھنا بھی ہوتی ہے بھلا کسی کو۔" وہ مسکرا نی کو شوش کر رہا تھا۔

"شوہر کے غیرِ محض ہونے میں بس ایک دستخط کی دیر ہوتی ہے۔" وہ سگدھ ہو چکی تھی۔ دوسرا جانب زید کو چکا گا تھا۔

☆☆☆

"مجھے سننے میں آیا ہے کہ تم کسی کو پسند کرتی ہو۔" اسے بھکارا کیا وہ جان گئے تھے۔ وہ ذرا بوكھلا گئی مگر جھوٹ وہ نہیں بولنا چاہتی تھی۔

"میں، مگر آپ سے کس نے کہا؟" اس نے لکھا دیا۔

"وہاں ہم نہیں ہے۔ تم ہر بتاؤ کہ اس کا نام کیا ہے؟" وہ کچھ مزید بوكھلائی۔ اب کیا کرے؟

"میں نہیں بتا رہی۔ ابھی کچھ کنفرم نہیں ہے۔ میں ایسے تو نام نہیں بتا سکتی نا؟" اسے بیک جواب بھیک لگا تھا کہ وہ یہ تاثر دے گی کہ وہ جو کوئی بھی ہے اس نے سوچنے کا وقت مانگا ہے۔ اب جھوٹ ہے تو جھوٹ کسی۔ شرم سے تو سچ جائے گی نا۔

"ویسے تم نہ بھی بتاؤ میں جانتا ہوں وہ کون ہے۔" وہ تھگراہٹ میں گھل رہی تھی جتنی موم کی طرح۔

اچھا سنتے پر لقین ہیں تو تائیں نام؟" اس نے ذرتے ذرتے ناپ کیا۔

"میں جانتا ہوں تم مجھے ہی پسند کرتی ہو، آئکس۔" وہ دم بخود گئی۔ آخر وہ کیسے جان سکتے تھے؟ وہ اگر وہ جانتے تھے تو کب سے جانتے تھے؟ وہ جیران بھی تھی اور پریشان بھی۔

[Click here](http://safareadab.com)

safareadab.com

وراثت

فاتحہ ملک

"اگر تمہاری مجھ سے شادی نہ ہوئی ہوتی اور تمہیں موقع ملتا تو کیا تم حسن خان کو پہنچائی؟"

رقیہ الجہی گئی۔ میں سمجھی نہیں آپ کی بات کا مطلب۔

وارث جان نے بہت سوچنے کے بعد سوال کا انداز بدل دیا۔ "تمہیں مجھ میں یا حسن خان میں سے کسی ایک کو چننا ہو تو کسے پنڈگی؟"

رقیہ وارث کے اس سوال پر ناراض ہو گئی۔ "کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔۔ یہ کیسا عجیب ساسوال ہے۔۔۔ آپ شوہر ہیں میرے اور وہ کوئی نہیں میرا۔۔۔ میں ساتھ پڑھتا ہے اور اچھا کلاس فیلو ہے۔ اس کا آپ سے کیا مقابلہ بھلا!!"

وارث جان ابھی بھی الجہاں اورتھا۔ رقیہ میں صرف تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم حسن خان کے ساتھ کوپا کر خوش رہ سکتی ہو تو۔۔۔" اس کے باقی الفاظ اندر کہیں دب کر رہے گئے تھے۔ رقیہ جو وارث جان سے کبھی اوپنی آذاز میں بولنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے وارث جان کے گال پر زور دار تھپٹھپڑا دیا۔۔۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ کیسے اس کا ہاتھ وارث پا گیا۔۔۔

☆☆☆

"اب مر تم نے کہیں رقیہ کو دیکھا ہے۔ مجھے گیٹ سے پتچالا کہ رقیہ آپکی ہے۔" رقیہ کی حسن کی طرف بیک تھی۔ رقیہ مسکراتے ہوئے پہنچ اور حسن خان وہیں دل تھام کر کھڑا ہو گیا۔ اف۔۔۔ کوئی اتنا خوبصورت کیسے ہو سکتا ہے۔" اس سے پکلے کہ حسن خان مزید کچھ اور کہتا رقیہ اس کی طرف بڑھی۔ حسن خان کی آنکھوں کی چکڑتاری ہتھی کہ آج وہ رقیہ کو پا لیجنے کے جنون سے آیا ہے۔ حسن خان کے ساتھ اس کی والدہ بھی تھیں۔ انہوں نے رقیہ کے لیے تعریف جملے کچھ اس طرح کہے۔ "بہت خوبصورت ہو تم اور آج تو بہت زیادہ حسین لگ رہی ہو۔ جانتی ہو آج حسن مجھے کیوں لایا ہے اپنے ساتھ؟؟؟" ابھی وہ مزید کچھ کہتیں کہ رقیہ نے مسکرا کر حسن کو مخاطب کیا۔

"حسن ان سے ملو میرے ہے بلند۔۔۔ سردار وارث جان۔" حسن کی آنکھیں پھٹ سی گئیں وہ بے اختیار بولا۔ "کیا؟؟ کیا کہا ہے تمنے۔۔۔ کون ہے یہ؟؟؟۔۔۔ مطلب تمہارے ساتھ کیا رشتہ ہے ان کا؟؟؟"

ناروں صراطِ مستقیم کی دیکھ جھلک

وہ مسلمان ناہوتے ہوئے بھی ان چیزوں سے دور
رہتا تھا وہ شراب نہیں پیتا تھا، اسی اُس کو لڑکیوں
سے میل جوں کرنا پسند تھا۔

آج بھی وہ ایسے ہی چلا آیا تھا۔ یہ جگہ ایسی تھی
جہاں کوئی کسی پر توجہ نہیں دیتا تھا۔

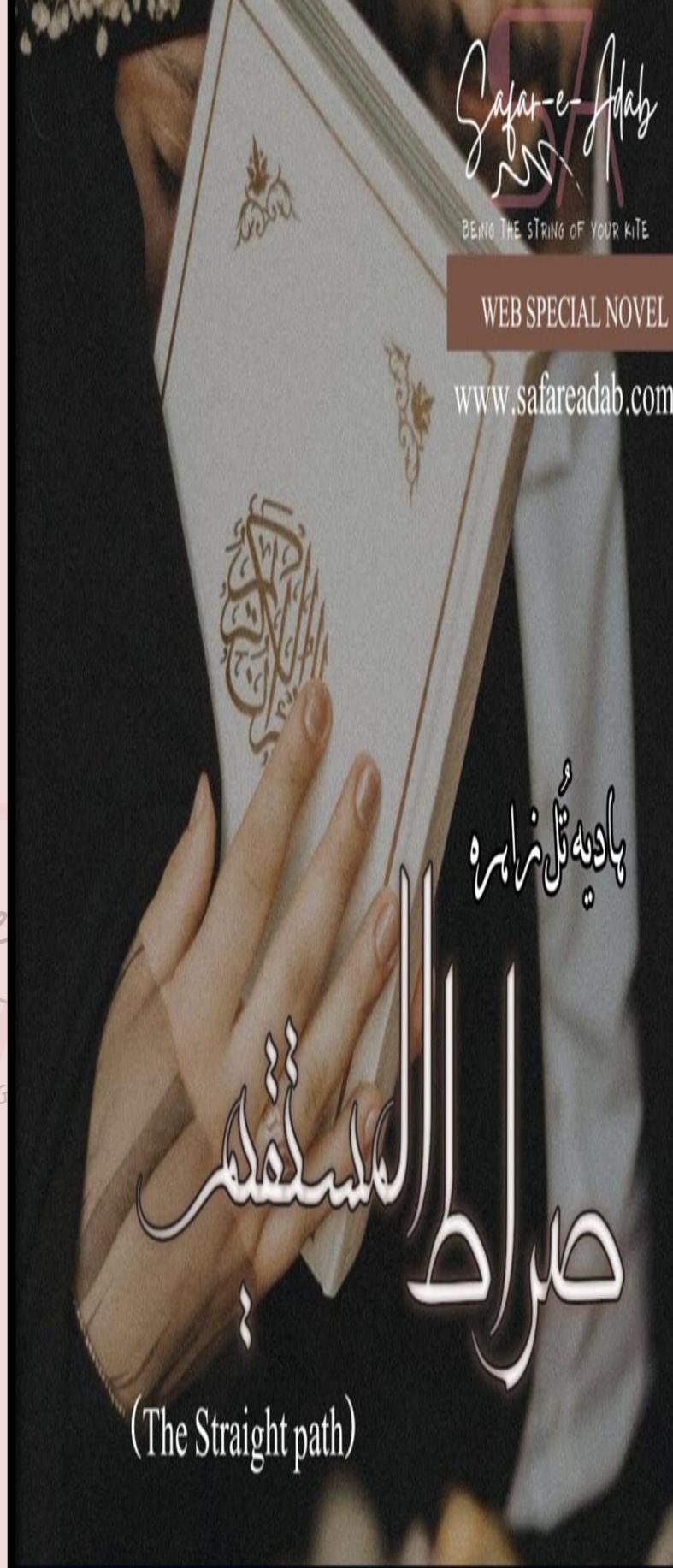
وہ اس سب شور کو پیچھے چھوڑتا۔ بیسمت میں آگیا

جہاں کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ ان سب کے سامنے^{Safar-e-Adab}
مشروبات پڑے تھے اور کچھ لڑکیاں لباس نہ
ہونے کے برابر پہنے لباس میں ان کے پاس بیٹھی
اور سامنے ناق رہی تھیں۔

وہ سب کو ایک نظر دیکھ کے ایک طرف بیٹھ گیا۔

”Bevi anche tu questo drink“

”تم بھی یہ مشروب پیو۔“



وہ صحیح کے قریب واپس ہو ٹل آیا اور کمرے میں آکے اوندھے منہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ ناجانے کس پھر اُس کی آنکھ لگی۔

صحیح اُس کی آنکھ فون کی آواز سے کھلی اُس نے ادھر ادھر ہاتھ مارے تو فون پینٹ کی جیب میں تھا۔ اُس نے فون نکال کے مندی مندی آنکھوں سے فون پہ جگمگاتے نمر کو دیکھا

لکھا آ رہا تھا۔ اُس نے کال Turhan Calling اٹھا کے فون کان سے لگایا۔

"ہیلو آرچر کہاں تھے تم رات کو تم گارڈز کے بغیر اکیلے کیسے کہیں جاسکتے ہو۔" وہ ہمیشہ کی طرح ہی کال پک ہوتے ہی شروع ہو گیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تم کیا صحیح شکلی بیویوں کی طرح شروع ہو گئے ہو۔ میں کوئی فیڈر پیتا بچہ تھوڑی ہوں۔"

اُن میں سے ایک لڑکے نے آرچر کو اطالوی میں پیشکش کی۔

"no, non mi piace"

"نہیں، مجھے یہ پسند نہیں"

آرچر نے سرد مہری سے جواب دیا۔

کچھ دیر ادھر بیٹھنے کے بعد وہ باہر نکل آیا

بے۔ رات گھری اور تاریک تھی وہ یوں نہیں بے مقصود سڑکوں پہ پھر تارہا۔ وہ سکون چاہتا تھا جو اُس کو کہیں نہیں مل رہا تھا۔ اچانک اُس کے ذہن

می جھماکا ہوا ایک گندمی تیکھے نکوش والی

لڑکی۔ اُس کے ناک میں چمکتا ایک ہیرا۔ اُس کی گھنی زلفیں۔ اُس نے اپنے خیال کو جھٹکا۔ پچھلے تین سالوں سے وہ اسکو ہر جگہ ڈھونڈ چکا تھا پر ناجانے وہ کدھر چھپی بیٹھی تھی۔

ٹرہان نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ درحقیقت تھا
بھی تو ایسے انکا پیار دیکھ کے کوئی نہیں مانتا تھا کہ
وہ دوست ہیں۔ پہلی ملاقات میں ہر کوئی ان کو
بھائی سمجھتا تھا۔

مکمل ناول فرمی میں پڑھنے کے لیے یہاں
کلک کریں۔

safareadab.com

"جو اکیلا کہیں جاؤں تو گم ہو جاؤں گا۔" آرچر
بھی اُس کی بات سنتا منہ کے بُرے زاویے بناتا
جواب دے رہا تھا۔

"آرچر تمہیں پتہ ہے کہ تمہارے کتنے دشمن ہیں
پھر بھی ٹم لاپرواہی کرتے ہو۔" ٹرہان نے اُس کو
سمجھانا چاہا۔

"اچھا خیر ٹم واپس کب آرہے ہو؟" آرچر کچھ
دیر خاموش رہا۔

"یار اُر بی میں کبھی کبھار سوچتا ہوں کہیں میں
پچھلے جنم میں تیری محبوبہ تو نہیں تھا؟ بھی مجھے
آئے ایک دن کوالگ اور ٹم واپس بلار ہے ہو بار
بار۔" آرچرنے لمحے کو معصومانہ بناتے ہوا کہا۔

"اللہ بچائے تجھ جیسی محبوبہ سے بھی جو بات ایک
نہیں مانتی اور نکھرے بھی ہزار دیکھاتی ہے۔"

سفر ادب کی جانب سے ناولوں کی پی ڈی ایف کا پی کو ہر
غلطی سے ماوراء بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ کسی
بھی طرح کی غلطی پائی جانے پر اسے محض اتفاق سمجھا
جائے۔ ہماری ٹیم کے تیار شدہ پی ڈی ایف کے تمام جملہ
حقوق سفر ادب کے نام محفوظ کر لیے گئے ہیں۔ کسی
ادارے یا شخص کی جانب سے ہمارے کام کو اپنے آفیشل
استعمال میں لانے کی کوشش کو غیر قانونی سمجھ کر سفر
ادب کی جانب سے کارروائی کی جاسکتی ہے۔

- ٹیم سفر ادب